رنگوں میں اُتر آنا

شفیق آصف



شفیق آصف کی شاعری میں اظہاریت کا رنگ و آہنگ، کیف و کرب کا امتزاج اور لہجے کی بے ساختگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ اُس کی تخلیقی اُپج نے عصری آگہی اور جستجوئے جمال سے جنم لیا ہے

رواں صدی کی گذشتہ چند دہائیوں میں انقلاب ساماں ارتقا کی رفتار اتنی تیز رہی ہے اور مسابقت کے رجحان میں کچھ اس انداز سے اضافہ ہوا ہے کہ قرار نا آشنا زندگی تنازعۂ بقا کی شدتوں میں مبتلا ہو کر رہ گئی ہے۔

دھرتی سے اُٹھ کر پرواز کا شوق اور کہکشاؤں پر کمندیں ڈالنے کی ہوس نے آج کے اِنسان کو جن خلاؤں سے رُوشناس کرا دیا ہے۔ اُن میں نہ تو جہات کا کوئی تصوّر ہے اور نہ ہی قدم جمانے کی کوئی طلب۔ ایسے زمانے میں خُود رفتہ، ہم عصروں کی بھیڑ میں تنہائی کا کرب، شفیق آصف کے لئے اجتماعی کرب سے ہم رشتہ و پیوستہ نظر آتا ہے۔ لیکن وہ حالات کی ناسازگاریوں اور سنگینیوں سے دل برداشتہ ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شفیق آصف کی شاعری میں بشارتوں کی کہکشاں بچھی ہوئی نظر آتی ہے۔

سید فخر الدین بلے

شفیق آصف اسّی کی دہائی میں ادبی اُفق پر طلوع ہونے والے نوجوان اُردو شعراء میں ایک معتبر اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی طبیعت کا اعتدال اور دھیما پن اُن کی شاعری میں بھی در آیا ہے۔

شفیق آصف کی غزل اپنے تمام تر کلاسیکی پیرہن کے باوصف فکری اور معنوی اعتبار سے تازگی اور تنوّع کا احساس دلاتی ہے۔ اِس ضمن میں اُن کے [illegible]

اشعار حوالے کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

محمد افسر ساجد

۰۰۰ کی دہائی سے غزل کی شاعری نے جو جدید رنگ اختیار کیا اُس میں غزل کہنے والے نوجوان شاعروں کی ایک بڑی کھیپ لہجے اور اسالیب کے اعتبار سے ناصر کاظمی، شکیب جلالی، ظفر اقبال، افتخار عارف، ثروت حسین اور اظہار الحق کے صوتی اور بصری رنگوں کا شکار رہی۔ شفیق آصف نے اس صورتِ حال میں اپنی جداگانہ شناخت پیدا کرنے کی انفرادی کوشش کی ہے۔ میرے نزدیک شفیق آصف کی غزل مٹی، دھنک اور محبت کی تکون سے عکس ریز ہوتی ہوئی پیکر میں آئی ہے۔ اور اپنے گرد پھیلے جہانوں میں اثر پذیر ہونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

شفیق آصف نے آوازوں کی بھیڑ میں اپنی آواز کو کسی بھی لہجے کی گونج اور بازگشت سے محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں یہ کامیابی کسی بھی نوجوان غزل گو کے لیے بہت ضروری ہے۔ شفیق آصف نے محبت کے عمل میں اپنے پورے وجود کو شامل رکھا ہے۔ وہ بیمار رومانیت کے اسیر شاعروں کی طرح محبت میں آدھے دھڑ تک محدود نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے ہاں محبت کسی فردِ واحد یا ذات تک محدود رہنے کی بجائے کائنات میں مٹی سے شفق تک پھیل گئی ہے۔ اظہار کے یہ حوالے شفیق آصف کی آواز اور رنگوں کو عہدِ موجود کے نوجوان اُردو شاعروں میں منفرد اور ممتاز کرتے ہیں۔

ممتاز اطہر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رنگوں میں اُتر آنا

ہم نے منظر کی کشش کو اپنی آنکھیں سونپ دیں
صُورتوں کی بھیڑ میں جب آئینے کم ہو گئے

رنگوں میں اُتر آنا

شفیق آصف

الحمد پبلی کیشنز
رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی)۔ لیک روڈ۔ لاہور

ہماری کتابیں ۔۔۔۔۔

خوبصورت، معیاری اور

کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین



ضابطہ

بارِ اوّل ــــــــ مارچ ۱۹۹۶ء

مطبع ــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس لا

سرورق ــــــــ امتیاز مرزا

کتابت ــــــــ رحمت علی انصاری

انتخاب ــــــــ احمد رضوان

ترتیب ــــــــ نوید شہزاد

قیمت ــــــــ ۱۰۰ روپے

انتسابؔ

ممتاز العیشی

اور

آنس مُعین

کے نام

Scanned with CamScanner

شفیق آصف میرے ہر موسموں کا ساتھی ہے مجھے اُس کی
شاعری اور شخصیت میں سوچ کی صداقتیں اور جذبوں کی لطافتیں
معصومیت کے چراغ لے کر صف بہ صف ایستادہ دکھائی دیتی ہیں
شفیق آصف ایک ایسا منفرد اور جدید غزل گو شاعر ہے۔ جس کا فن
حرف حرف کو گویائی، لفظ لفظ کو زیبائی اور جذبوں کو پیکر عطا کرنے
میں یکتا ہے چمکتے سورج، دمکتے ستاروں اور نیلگوں آسماں کی وسعتوں
میں اُس کا طائرِ خیال اِس طرح محوِ پرواز رہتا ہے جیسے کوئی پرندہ کائنات
کی تنظیم نو کے لئے مصروفِ عمل ہو۔ سبزہ و گل کی مہکاریں، مہ وشوں کی
شوخیاں اور دلوں کی دھڑکنیں شاعری کے سفر میں اُس کی ہمرکاب
ہوتی ہیں۔ شفیق آصف صریرِ خامہ سے صوت و آہنگ کو تخلیق کرتا
ہے وہ زیست کے لامحدود امکانات کی تلاش میں رہتا ہے یہی
وجہ ہے کہ اُس کی شاعری میں اِنسانی زندگی کا معروضی اور باطنی عکس
نمایاں نظر آتا ہے۔

اختر جعفری

فہرست

غزلیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

عصرِ رواں کی غزل

آصف مرے افکار علامت ہیں سحر کی
شعروں میں مرے عصرِ رواں جاگ رہا ہے

شفیق آصف عصرِ رواں کا جواں فکر شاعر ہے۔ اس کا جوان ذہن جب بھی سوچتا ہے، سحر اور روشن سحر کے بارے میں سوچتا ہے۔ جدید دَور کا یہ شاعر جب تخلیق کرتا ہے تو اس کے شعروں کے قالب میں عصرِ رواں کی محکم اور محتشم، بیدار اور بے قرار رُوح کارفرما نظر آتی ہے۔ اس کی غزل کہیں بھی یاس، خوف اور حُزن سے مملو دکھائی نہیں دیتی۔ وہ کبھی بھی مسلکِ گوسفندی اختیار کرتے ہُوئے ہزیمت اور پسپائی پر قانع نہیں ہوتا۔ وہ آدمیت کا احترام کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ انسان کی قدر و قیمت کا عارف ہے۔ وہ انسانی تعلقات کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس لئے کہ وہ محبت کے حقیقی مفہوم سے واقف ہے۔ شفیق کی پُوری غزل میں کہیں بھی نہ یادِ ماضی کے عذاب ہیں اور نہ عیش و طربِ دوش کے مسحور کُن فسانے۔ اس کی غزل میں نہ صحرائے نجد کے مناظر ہیں اور نہ تصوراتی محبوب کے سلئے کے تعاقب میں پیہم دواں گریباں چاک دیوانے۔ اس کی غزل میں بس عصرِ حاضر ہے۔ جیتا جاگتا،

شاعر کا اپنا زمانہ ہے وہ دیکھ رہا ہے، محسوس کر رہا ہے جس میں وہ سانس لے رہا ہے، جی رہا ہے۔ وہ اسی زمانے کے رنگوں سے ہمارے سامنے سوچ تصویر پیش کرتا ہے اور امروز کی لکیروں سے فردا کا ہیولیٰ تیار کرتا ہے۔ میرے خیال میں اسی عصری زاویے نے اس کی غزل کو منفرد رنگ اور آہنگ عطا کیا ہے۔

شفیق آصف آدمی کو اِنسان دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ آدمیت کے سر پر دستارِ شرف دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جب عصرِ رواں میں اُسے انسانیت کا شکستوں سے چُور چُور بکھرا بکھرا نظر آتا ہے۔ جب اُسے آدمیت کی دستار، تار تار نظر آتی ہے، تب بھی وہ اس خرابی میں مضمر تعمیر کی سوچتا ہے۔ وہ آدمیت کی لاش پر بین نہیں کرتا۔ وہ انسانیت کی لحد پر نوحہ خوانی نہیں کرتا بلکہ آدمی کو اس کا مقام اور اِنسان کو اس کا شرف واپس دلانے کے جتن کرتا ہے۔ شاعر جب اپنے دَور کے آدمی پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی آنکھ کا حساس عدسہ کوئی من بھاتی تصویر نہیں بناتا۔ شاعر کو اِنسان ویسا نظر نہیں آتا جیسا وہ اُسے دیکھنا چاہتا ہے۔ چاہنے اور ہونے کے درمیان یہ فرق، اُسے بے چین کر دیتا ہے۔

اس دَورِ پُرفتن میں حیوان بن گیا ہے
فطرت کو جانے کیا تھی اُمّید آدمی سے؟

جانے کیوں اِس دَور کا ہر آدمی
محو ہے اِنسان کی تذلیل میں؟

اِک کھلونے کی طرح انسانیت کا ہے وُجُود
شاہراہِ زندگی پر ٹُوٹ کر بکھرا ہُوا

آدمی اپنی تباہی کی طرف ہے گامزن
ہم چلے تھے کس طرف لیکن کہاں تک آگئے ؟

اس طرح اپنی ذات میں تنہا ہے آدمی
بچھڑی ہو جیسے کونج کوئی اپنی ڈار سے

سوال یہ ہے کہ کونج آخر ڈار سے کس طرح بچھڑ گئی ؟ آدمی، انسانیت کی راہ پر چلتا چلتا آخر کیوں بھٹک گیا ؟ اور انسانیت، شاہراہِ حیات پر ٹوٹے کھلونے کی طرح کیوں بکھر گئی ؟ شاعر کے نزدیک اس حادثے کا سب سے بڑا سبب سماجی اقدار کا مسخ ہو جانا ہے۔ عصرِ رواں میں آفاقی اقدار کے مفاہیم کا بدل جانا ہے۔ جب ماحول پر حبس کی حکمرانی ہو اور انسان ارزاں ہو جائے۔ جب ہواؤں سے آزادی چھین کر انہیں محبوس کر دیا جائے۔ جب فضاؤں میں تعصب اور افتراق کا زہر ملا دیا جائے۔ جب زندگی کے چہرے سے شادابی اور حُسن نوچ کر، اس پر آسیبی ماسک چڑھا دیا جائے تو آدمیّت کا اعتبار اور انسانیت کا وقار ضرور مجروح ہوتا ہے۔

آج سورج ہے قید میں شاید
آج بادل سروں پہ کالے ہیں
کج رَوی، افتراق و محرومی
سب اِسی عہد کے حوالے ہیں

یہاں شگفتہ ہواؤں کا کون طالب ہے ؟
یہاں تو حَبس کا موسم ہے سازگار اب تک

بھٹکتے پھر رہے ہیں ہم نہ جانے کن جزیروں میں
خود اپنے پاؤں میں ڈالے ہوئے زنجیر مٹی کی

جانے کب اور کس جگہ سانسوں کو آزادی ملے
دُور تک اِک سلسلہ ہے حبس کا پھیلا ہُوا

فضا پر حکمرانی ہے ابھی تک حبس کی آصف
یقیناً رُت بدلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

جب شاعر رُت بدلنے کی بات کرتا ہے تو اس کی شاعری میں بیم و رجا کا آہنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہیں یاس کی آندھیوں کے راستے پر آس کا جلتا چراغ نظر آتا ہے۔ محرومیوں کے تاریک جنگل میں جگنو کی روشنی اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ بیاباں کی شبِ تاریک میں گم کردہ راہ مسافر، قندیلِ رہبانی کا نظارہ کرتا ہے۔ اب شاعر، راہرو کو منزلوں کا نقیب کہتا ہے۔ اب اُسے زمین پر بکھری آدمیت کے مقسوم میں آسمانی بشارتیں لگتی ہیں۔ شاعر کے رجائی لہجے کو پُوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے۔

خزاں کے خوف سے سہمے پرندو، لَوٹ بھی آؤ
تمہیں پھر لہلہاتی ٹہنیاں آواز دیتی ہیں

اب شاعر ایسے موسم کی نوید دیتا ہے جس میں غنچے وا ہوتے ہیں۔ ادھوری خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ فضاؤں میں رنگ و نکہت کا چلن عام ہوتا ہے۔ لیکن شاعر سمجھتا ہے کہ ایسے موسم کی تخلیق کسی اعجاز یا اتفاق کا ثمر نہیں ہوگی، اسے لانے کے لئے ہم سب کو اپنے تئیں کاوش کرنا ہوگی۔ شاعر کو یقین ہے کہ اچھے دن ضرور آئیں گے مگر کیسے؟ اس کے لِئے شاعر ایک جامع نصاب تجویز کرتا ہے۔

مہر و اخلاص کے وسیلے سے
سارے ذہنوں پہ تُو خدائی کر

پہلے اپنے خوُن میں پھیلی ہوُئی نفرت نکال
پھر محبت کے حوالوں میں کوئی وسعت نکال
تیرگی کے زہر میں ڈھل جائے نہ تیرا وجُود
جس طرح ممکن ہو، شہرِ ذات سے ظلمت نکال

شبِ سیاہ میں خوابِ ہُنر کو زندہ رکھ
صلیبِ وقت پہ نقشِ سحر کو زندہ رکھ
ہر ایک چیز تو پتّھر نہیں ہُوا کرتی
تُو اپنی آنکھ میں ذوقِ نظر کو زندہ رکھ
اگر نہیں کوئی سورج تو دِل کے آنگن میں
دیئے کی لَو میں لہُو کے سفر کو زندہ رکھ

مُجھے یقین ہے کہ شفیق آصف نے اگر شبِ سیاہ میں خوابِ ہُنر کو زندہ رکھا، جادۂ عصرِ رواں پر اگر جوان لہُو کے سفر کو زندہ رکھا، تو ایک دن اُس کے من آنگن میں سُورج ضرور اُترے گا۔ ایسا سُورج جس کی تابانی اُس کی ذات کو زیادہ منوّر اور اس کی غزل کو زیادہ توانا اور معتبر بنا دے گی۔

شخصیت سازی میں بھی کُچھ وقت لگتا ہے شفیق مرتبہ ملتا ہے لیکن دفعتاً نہیں ملتا

پروفیسر ڈاکٹر شمیم حیدر ترمذی
۱۰ر جنوری ۱۹۹۶ء

چاند، مَیں اور شفیق آصف

شفیق آصف ایک نوجوان شخصی حوالہ بھی ہے اور ایک نمائندہ فنی مثالیہ بھی۔ وہ کسی محفل میں گفتگو کرے یا کہیں مشاعرے میں غزل خوانی، ایک جیسی متانت روا رکھتا ہے۔ مائیک کے سامنے ہو یا دوست کے رُوبرُو مانوس لگتا ہے ——

شفیق آصف نے ادب کی دُنیا میں اس وقت قدم رکھا جب اُس کی عُمر سترہ برس سے زیادہ نہ تھی کالج میں داخلہ لیا تو دُور تک پر پھیلا دیئے اُڑان کا یہ عالم تھا کہ سارا سارا دِن زمین و آسمان کی وسعتیں زیرِ پَر رہتیں۔ ادبی پروگراموں کا انعقاد، محفلوں میں شرکت، ادبی جرائد و اخبارات کے صفحات میں شمولیت، اور "ندرت" کی ادارت کچھ ایسے "فوٹو گرافس" ہیں کہ جن سے ہم اُس کی تخلیقی و تنظیمی سرگرمیوں کا البم تیار کر سکتے ہیں ——

شفیق آصف کی شاعری ایک مہذب اور شائستہ اِنسان کی شاعری ہے۔ اُس کی شاعری میں اُس کے جوان جذبات، شعلہ آفریں خیالات اور شبنم جیسے محبت بھرے نغمات بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ شفیق آصف

کو سُنا جائے یا پڑھا جائے یہ ہر صورت میں سامع و قاری کو متاثر کرتا ہے۔ شفیق آصف میرے اُن ساتھیوں میں سے ہے جو عُمر میں میرے بچّوں کے برابر ہیں مگر اس انداز سے ملتے ہیں جیسے انتہائی بے تکلّف دوست ...... اُس میں محبت کا وہ جذبہ موجزن ہے جو مشکل کسی کو میسّر آتا ہے گرمیوں کی شامیں ہم نے بابا ہوٹل، خان کیفے ٹیریا اور کیفے ٹی میں اکٹھے گزاری ہیں واپسی کا سفر یوں ہوتا کہ ہم ایک دُوسرے کو غزلیں سُنا رہے ہوتے نواں شہر سے قلعہ کہنہ۔ قلعہ کہنہ سے دولت گیٹ اور پھر چوک کمہاراں والا۔ سرور نغمی راستے میں اپنے گھر چلا جاتا اور شفیق آصف اپنے گھر کا سفر طے کرتا۔ دُوسرے تیسرے دن طفیل ابنِ گُل بھی ہمراہی بن جاتا طفیل کو خوفناک دہشت انگیز اور حیرت افزا باتوں سے بڑی دلچسپی تھی اُن دنوں یہ سارا راستہ تقریباً ویران و سنسان ہُوا کرتا تھا بابا دولت شاہ کو سلام کرتے ہی طفیل ابنِ گُل کسی جن کسی ڈاکو یا کسی ناگ کا ذکر چھیڑ دیتا۔ گلستان چوک تک پہنچتے ہم الف لیلوی دَور میں آجاتے۔ پھر شفیق آصف اور سرور نغمی نے ادبی معرکہ آرائی کیلئے مُشترکہ محاذ کھول لیا پہلے تخلیق اکادمی وجُود میں آئی پھر ادبی مجلہ "ندرت" اور "تشکیلِ نو" کے ہفت روزہ ادبی ایڈیشن کی بنیاد پڑی۔

ادبی محفلوں میں شرکت کے لیے بیرونِ شہر جانا اور پھر زیادہ بے تکلّف دوستوں کے ساتھ لوٹنا بذاتِ خود کسی مہم سے کم نہیں ہوتا۔ بہاول پُور، رحیم یار خان، لیاقت پور، ڈیرہ غازیخان، مُظفر گڑھ، کروڑ لعل عیسن، بھکر، لودھراں، بُورے والا، ساہیوال، فیصل آباد، جھنگ، لاہور اور ایبٹ آباد کے خوبصُورت مشاعروں میں شفیق آصف اور ہم نے کئی بار ایک ساتھ سفر کیا اگر سفر طویل ہو اور ہم سخن ایک دُوسرے کے ساتھ زیادہ ہی بے تکلّف ہو چکے ہوں تو پُوری فضا تبسّم و ترنّم ریز ہو جاتی ہے۔ عاصی کرنالی، حسین سحر، انور جمال، اختر جعفری، سرور نغمی، کوثر ثمرین، بُشریٰ بلوچ، سحر سیال، اظہر سلیم مجوکہ، نثار احمد طیب، طاہر سلیم اور شفیق آصف ایک ائیر کنڈیشنڈ کوچ میں سفر کر رہے ہیں۔ منزلِ مقصود تین سو کلو میٹر

Scanned with CamScanner

دور سے لطیفے ختم ہو چکے ہیں ماضی کے افسانوں کا کوٹہ "ٹمک" گیا ہے مصرعے پر مصرعہ کہنا بوریت میں داخل ہو گیا تو کوثر ثمرین کو بہت دور کی سُوجھی مترنم مشاعرہ شروع ہو گیا ہمیں معلوم نہیں تھا کہ شفیق آصف اس کڑے امتحان سے بھی کامران گزرے گا۔ عورتیں تو تھوڑا بہت گا ہی لیتی ہیں لیکن تعجب اس وقت ہُوا جب کو ہِ حج میں سفر کرنے والے بزرگ شاعر بھی ترنم ریزیاں فرمانے لگے۔

شفیق آصف کو ریڈیو والوں نے بھی بہت جلد "بلانا" شروع کر دیا تھا ادبی پروگراموں کے علاوہ فیچرز اور طویل دورانیے کے ڈرامے لکھ کر اُس نے یہ بھی ثابت کیا کہ وہ ایک کردار نگار بھی ہے شفیق آصف نے "نوائے وقت ملتان" کے لیے طویل عرصے تک کالم نگاری بھی کی — مگر اُس نے اپنے کالموں میں ایسے لوگوں کی تعمیر نہیں کی جو جہالت کا بحر الکاہل اور حماقت کا امیر البحر بننے کی کوشش کر رہے ہیں صُورتِ حال یہ ہے کہ اکثر کالم نگار اُن شعبوں کے خلاف لکھتے ہیں جن میں وہ سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوتے ہیں یُوں وہ اخلاقی و ادبی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں یہ لوگ ادیب اور شاعر کہلاتے ہیں اور درباری داری کے تمام تقاضوں پر پُورا اُترتے ہیں ——

شفیق آصف نے سرکار کی خدمت میں کوئی عرضی نہیں گزاری یہ قصیدے نہیں لکھتا اور نہ ہی اُسے اس بات سے دلچسپی ہے کہ کسی شخص کی بے عزتی سے لُطف ملتا ہے یا نہیں! شفیق آصف کا شاعر ہونا اُس کے آبائی ماحول سے مُنسلک نہیں ہے وہ چاہتا تو زمینداری کرتا، کسی سیاسی پارٹی سے متعلق ہو کر کروڑوں میں قرضہ لیتا اور کسی بڑے کا ساتھ دے کر وہ قرضہ معاف کرا لیتا —— شاعر ہونے میں یہ قباحت ہے کہ وہ دنیادار نہیں رہتا اور اگر دُنیادار بنے تو شاعر نہیں رہتا ——

کہا جاتا ہے کہ وہ شاعر اور ادیب جو اپنی تخلیقات میں چاند کا ذکر بار بار کرتے ہیں ماضی پرست ہوتے ہیں ایسے فنکار اپنی تنہائی میں چاند سے محفل آرائی کرتے ہیں

شفیق آصف نے بھی چاند سے مکالمہ کیا ہے اور یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ جب بھی چاند کا ذکر کرتا ہے محبت سے کرتا ہے۔ انتظار حسین، ناصر کاظمی، احمد مشتاق، اے حمید اعتبار ساجد اور میری طرح شفیق آصف بھی ماضی پرست ہے۔ ماضی پرست وہی ہوتا ہے جس کا کوئی ماضی ہو — ماضی بھی سب کو میسر نہیں آتا خوبصورت دن گزر جاتے ہیں اور یادیں چھوڑ جاتے ہیں شفیق آصف نے اپنے ماضی کو کئی بار دہرایا ہے وہ خود بھی رویا ہے اور ہمیں بھی رُلایا ہے۔

نئی نسل جس انداز سے زیست کر رہی ہے وہ اُس کا حق بھی ہے اور معیار بھی۔ مَیں یقیناً یہ استحقاق نہیں رکھتا کہ نئی نسل کے کسی فرد کو فنونِ لطیفہ میں نئے تجربات کرنے سے روکوں — موسیقی، شاعری، مصوری اور سنگ تراشی کے ضمن میں روایت و جدت بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

مَیں بیس سالہ شاعر کے رُوبرُو روایت پرست ہُوں مگر آج سے بیس سال پہلے اپنے بزرگوں کے سامنے جدید، جدید تر اور جدید ترین بھی تھا۔ مَیں شاعر کو اصل کے حوالے سے پہچانتا ہُوں اور اصل کی کیفیت کو شاعری کی رُوداد میں دیکھتا ہُوں مجھے ظاہر ہے کوئی شخص بھی مجبُور نہیں کر سکتا کہ مَیں شفیق آصف جیسے خُوبصُورت شاعر کو جدید ترین شاعر نہ کہوں وہ بہت اچھے شعر کہتا ہے۔ وہ ایک اچھا انسان بھی ہے اور پُورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہے ایسے افراد نہیں ملتے اور اگر مل جاتے ہیں تو اُنہیں بخوشی شفیق آصف کہا جا سکتا ہے۔

اقبال ارشد

۱۵ر دسمبر ۱۹۹۶ء

شفیق آصف — اِنسانی قدروں کی شکست کا نوحہ گر

(۱)

جب مُعاشرہ سماجی رویّوں میں رزالت کی اس سطح پر آجائے جہاں گھوڑوں اور کُتّوں کا آب و دانہ تو جہازوں پر بیرونی ممالک سے دَرآمد کیا جائے اور ان کی خدمت پر مامور اشرف المخلوق کو صرف زندہ رہنے کے لیے "بھوجن" دیا جائے اور دُوسری جانب گلی کوچوں، بازاروں، مسجدوں، معبدوں حتیٰ کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں، کچہری عدالتوں کے احاطوں میں بے گناہ اِنسانوں کی بوٹیاں ہوا میں اُچھال دی جائیں۔ جہاں آدم زاد کی ارزانی مکھیوں، مچھّروں کی ناقدری سے بھی زیادہ ہو —— وہاں آرٹ کیا مزاحم ہو گا؟۔

—— مزاحمت تو سیاسی، استحصالی اور صاحبِ اقتدار قوتوں کے خلاف ہُوا کرتی ہے۔ جہاں فرقہ وارانہ وحشت نے مذہبی جنونیوں کے سینوں میں دِل کی جگہ پتھر کی سِلیں رکھ دی ہوں۔ وہاں احساس دم بخُود رہ جاتا ہے۔

جہاں جنّت کے دلآویز باغوں میں خُوش ادا حُوروں کی صحبت کی نوید —— اور گل عِذار غلمان کی شانِ دلبرائی کی بشارت کلمہ گو ہم وطن کو جانور کی طرح کاٹنے پر اُکسائے وہاں چوری۔ ڈاکہ۔ فریب۔ خُود غرضی۔ خیانت۔ منافقت۔ جذبوں کی تحریف۔ مُعاشی اور سیاسی استحصال جیسے جرائم بہت چھوٹے نظر آتے ہیں۔

"آرٹ" ـــــ احترامِ انسان کی قدروں کا محافظ ہوتا ہے جہاں سوسائٹی خود انسان کی حفاظت نہ کرسکے، وہاں انسانی جذبوں کی توقیر کی حفاظت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایسے میں "آرٹسٹ" کے دو ممکنہ ردِ عمل ہوسکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ شدید غم و غصّے میں ہیجانیت سے مغلوب ہوکر VIOLENCE اختیار کرے گا ـــــ (شدید ہیجانی کیفیت میں اوّل تو تخلیق کا عمل ممکن ہی نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو فن "نعرہ بازی" اور "چیخ" کی سطح سے اُوپر نہیں اُٹھتا)۔

ـــــ دُوسرا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ ایسے میں فنکار کی تخلیق کے سوتے خشک ہوجاتے ہیں کیونکہ "نظم کاوی" بے معنی چیز بن جاتی ہے۔ شاعر ادیب حیرت زدہ (مبہوت) ہوکر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے ـــــ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے۔ لیکن نہیں بول سکتا۔

(۲)

ہمارے عہد کا تخلیق کار خاص طور پر "نوجوان شاعر" ایسی شاعری (اسے شاعری کہنا بھی محلِّ نظر ہے) کرتا چلا جاتا ہے ـــــ جس کی بُنیاد محض واہمہ ہے۔ وہ خیال کی نُدرت، فکر کی گیرائی، جذبے کی شدّت، تجربے کی لَو اور فنّی جمالیات سے ناواقف ہوتا ہے۔ بس ایک جنونی کیفیّت ہوتی ہے ـــــ ہر پندر واڑے میں ایک نیا شعری مجموعہ چھپوانے والے خُود فریب شاعروں کا ایک جتھا موجُود ہے۔ بُک سٹالوں پر خُوش نما ٹائیٹلوں کے ساتھ ضخیم مجمُوعے پڑے ہُوئے ہیں ـــــ ساقط الوزن سطریں مضحکہ خیز مضامین۔ جنہیں دیکھ کر ایک سلیم الطبع شخص سر پکڑ لیتا ہے کہ اگر یہی شاعری ہے تو دیواروں پر لکھے اِشتہاروں اور ٹرکوں کے پیچھے لکھے ہُوئے شعروں میں کیا قباحت ہے۔

(۳)

شفیق آصف بھی اِسی عہدِ پُر آشوب میں زندہ ہے لیکن اُس نے شاعری کو "کارِ بیکاراں" کے طور پر نہیں اپنایا ـــــ نہ اسے دیوانگی بننے دیا ہے۔ ایک

باجوش اور باشعور فرزانے کی طرح وہ جب تجربے اور مشاہدے کے بعد تخلیقی SPRESS میں آتا ہے تو اپنے جذبے قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔ گردوپیش کی بہیمانہ مظالم کی گرم بازاری اسے بھی دکھائی دیتی ہے۔ اقتدار اور اختیار حاصل کرنے والی انسان نما مخلوق کی لوٹ کھسوٹ کو وہ بھی جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جن کے بام و در ہم نے خون سے روشن کئے ہیں وہ تیرگی سے ہماری تقدیریں لکھتے ہیں۔

جس کے بام و در کئے تھے میں نے روشن خون سے
لکھ رہا ہے تیرگی سے وہ مرا مقسوم پھر

شفیق آصف کی غزل میں جو موضوع بہ تکرار ملتا ہے وہ پتھر کے سامنے آئینہ، نفرت کے مقابلے میں محبت، سختی کے مقابل نرمی — سزا کے جواب میں دعا کا رویّہ ہے۔ شفیق آصف کا یہ رویّہ ایک درویش سادھو کا رویّہ ہے۔ نفرتوں کی سرد مہری کی فضا میں محبت کی دھوپ دینے والے سورج کی خبر دینے والے کا یہی نقطہ نظر ہوتا ہے۔

تمہاری نفرتوں کے وار سہہ کر
محبت کا قرینہ آ گیا ہے

وفا کی تاریخ لکھ رہا ہوں
لہو لہو میری انگلیاں ہیں

ہم کسی سے داستانِ دل کہیں تو کس طرح
تم نے اس قابل بھی اے ظالم کہاں رہنے دیا

(۴)

اردو غزل ایک توانا روایت کی حامل ہے جہاں میر و سودا، غالب و مومن

آتش و ذوق، حالی و اقبال، فانی، حسرت اور فیض و فراق نے گلزار مہکا رکھے ہیں۔ ہر بڑی شاعری اپنے عصر کی گواہی دینے اور زمان کی پہچان کرانے کے ساتھ ساتھ آفاقی ہو جائے تو کہنا چاہیے کہ اس نے تخلیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ شفیق آصف کے ہاں ایسے شعر موجود ہیں جو زمان کی عصری گواہی دیتے ہیں، ناہمواری کا تذکرہ ہے لیکن اس کا لہجہ چیخ یا نعرہ یا شور نہیں بنتا۔

کج روی، افتراق و محرومی
سب اسی عہد کے حوالے ہیں

آدمی اپنی تباہی کی طرف ہے گامزن
ہم چلے تھے کس طرف لیکن کہاں تک آ گئے

اے کاش، سطحِ آب سے اندازہ کرتے ہم
طوفانِ تند و تیز کئی زیرِ آب تھے

جانے کب اور کس جگہ سانسوں کو آزادی ملے
دُور تک اِک سلسلہ ہے حبس کا پھیلا ہُوا

جانے کیوں اس دَور کا ہر آدمی
محو ہے انسان کی تذلیل میں

(۵)

شفیق آصف نے جب فنی آنکھیں وا کیں۔ اس وقت اُس کا عہد منافقت کے

Scanned with CamScanner

دُہرے عذاب میں تھا۔ پُرانی نسل صرف پاجامہ پوش، گلوری دہن، کج کلاہ طرحداروں کو ہی شاعر سمجھتی تھی۔ وہ لوگ حسینۂ الفاظ کی نزاکت اور محبوبۂ فقرات کی عشوہ گری پر جان دیا کرتے۔ "اعلیٰ مضامین" کی تازہ کاری کا طعن و تشنیع سے استقبال کرتے ـــــ جب کہ نئی نسل کم کوشی اور کم علمی کا شکار تھی۔ اُردو اور فارسی ادب کی روایت سے بالکل ناواقف بس ایک جنونی بلکہ مرگیانہ EPILEPTIC کیفیت میں جوائنٹ شنٹ ان کے قلم سے نکلا اسے شاعری سمجھ لیا اور اساتذہ کو خاطر میں نہ لائے نتیجہ یہ نکلا کہ ہر دو طبقے نہ صرف ناقبول بلکہ نقصان دہ ٹھہرے۔ ایسے میں مناسب TALENT رکھنے والا فنکار عجیب اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے خُود ہی اپنی شاعری کو اپنی تنقیدی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔

شفیق آصف نے یہ مُشکل کام بڑے حوصلے اور صبر سے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بزرگوں اور اساتذہ کے ادب آداب اور سلام تسلیمات کا قائل ہے۔ چنانچہ اسے اپنی شاعری میں اپنے معاصر نوجوانوں سے زیادہ کامیابی ہُوئی ہے۔

(۶)

معاشرے کی قدری ٹوٹ پھوٹ، اِنسان کی بے وقعتی۔ جذبوں کی تحقیر ـــ اِنسانوں کا اِنسان کے ہاتھوں قتل ـــ خوابوں کی شکست اور عظمتِ انسانی کی بے بسی و بے حُرمتی کا نوحہ شفیق آصف سے مسلسل غزل کی صُورت میں سنیئے۔

خُود ہی رو کر گیت سُنانے لگتے ہیں
خُود ہی خود کو ہم دیوانے لگتے ہیں
خود ہی خود کو کرتے ہیں ہم قتل یہاں
خُود ہی اپنا سوگ منانے لگتے ہیں
خود ہی سُولی چڑھتے ہیں پچھتاوے کی
خود ہی اپنا من پرچانے لگتے ہیں

Scanned with CamScanner

خود ہی چہرہ چہرہ چُنتے ہیں خود کو
خود ہی سارے نقش مٹانے لگتے ہیں
خود ہی پھلجھڑیوں کے کھیل کو کھیلیں ہم
خود ہی خود کو آگ لگانے لگتے ہیں
خود ہی دیپ جلا کر اس کی یادوں کے
خود ہی درد کا شہر بسانے لگتے ہیں
خود ہی ہٹ جاتے ہیں سوچ دریچے سے
خود ہی اس میں آنے جانے لگتے ہیں
خود ہی گُم کرتے ہیں خود کو لمحوں میں
خُود ہی اپنا کھوج لگانے لگتے ہیں
خود ہی شکوہ کرتے رہتے ہیں دِل کا
خود ہی خود کو پھر سمجھانے لگتے ہیں
خود ہی اِک تصویر مٹاتے ہیں دِل سے
خود ہی وہ تصویر بنانے لگتے ہیں
خود ہی آصف لکھتے ہیں تعبیریں ہم
خود ہی اپنے خواب چُرانے لگتے ہیں

پروفیسر انور جمال

نقشِ احمریں

شفیق آصف کی شاعری قلزمِ ارض کے مغربی ساحل پر شام سمے طلوع ہونے والے احمریں نقش کی مثال جمال انگیز تو ہے، لیکن اس کی تاثیر کا دورانیہ عہدِ شفق کی طرح محدود نہیں ہے۔ شفیق آصف MOST MODERN SENSIBILITY کا مالک ایسا سخن طراز ہے جس نے "معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود" کے آہن گداز اصول کی پیروی کرتے ہوئے عین عنفوانِ شباب میں خود کو مسلّم الثبوت شاعر کی حیثیت سے منوا لیا ہے۔

محبت — شفیق کی شخصیت اور شاعری کا نیوکلیس ہے کہ اسی کو مرکز مان کر اس کی ذات اور تخلیقی جوہر نے نشوونما پائی ہے۔ محبت سے شفیق کی کمٹ منٹ کی نوعیت وہی ہے جو نسبت سُورج کے ساتھ عُطارد کی بتائی جاتی ہے کہ عُطارد قربِ آفتاب کے سبب سب سے زیادہ خزینۂ حرارت سے مالا مال ہوتا ہے اور مختصر قامت کا یہ سیارہ، سُورج کے گرد اپنا چکّر سُرعت سے مکمل کر لیتا ہے۔ شاید نہیں یقیناً شفیق کو اِس شعور کا اثاثہ ثروت نصیب ہُوا ہے کہ مُشتری، یورنیس اور نیپٹون اپنے حجم میں بہت بڑے ہونے کے باوجود بے حد سُست رفتار اور ٹھنڈے ہوتے ہیں، کیونکہ وہ سُورج سے بہت دُور ہوتے ہیں — محبت کے خورشیدِ جہاں تاب کے گرد اس عُطارد کا سفر جاری ہے۔

شفیق آصف کے ہاں رُوحِ عصر کی صداؤں کے صحرا اپنی شدّتوں کے اِعتبار سے تو شوریدہ سر طُوفانوں کی طرح بے قرار ہیں لیکن اس اضطراب کی صُورت گری کو اپنے بھرپور اثر سمیت ہلکے رنگوں اور دھیمے لہجوں کے ساتھ مشروط ہونے کی یقین دہانی کے بعد ہی صفحۂ قرطاس پر منتقل ہونے کا اذن عطا ہُوا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اس مجموعے کے کسی ایک مصرعے میں بھی نعرے یا وعظ کے ذریعے صداقتوں کو مسخ کرنے کے جُرم کا ارتکاب نہیں ہُوا۔ ہاں سطور میں مستور کرب اور جذبے کے سوا درد و الم کا باقی سارا جوار بھاٹا شاعر نے اپنے مضبُوط دل پر سہہ لیا ہے اور اَب میں کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ قلبِ شفیق میں وسعت زیادہ ہے یا اس کا جہانِ سُخن زیادہ وسیع ہے۔؟

جمیل احمد عدیل

حمد

کچھ ایسے شاعری کو مری خدّ و خال دے
شہرِ سخن میں جس کی زمانہ مثال دے

تاریکیوں کا حبس ہے میرے وجود میں
جذبوں کی روشنی سے مرا دل اُجال دے

روشن رہیں چراغ محبّت کے عُمر بھر
کچھ ایسا ذوقِ دید کو عکسِ جمال دے

یکتا ہے تُو، نہیں ہے کوئی تجھ سا دوسرا
کس کو مجال ہے کہ وہ تیری مثال دے

کاسہ بدست پھرتے ہیں راہِ طلب میں ہم
ممکن نہیں جواب تو اذنِ سوال دے

ڈرتا ہوں شہرِ ذات کے ماحول سے شفیق
مجھ کو حصارِ خوف سے مولا نکال دے

نعت

نہ خواہش ہے ثوابوں کی نہ منشا مال و زر کا ہے
گدا ہوں تیری گلیوں کا مقدّر تاجور کا ہے

مری آنکھوں میں اب تک کوئی بھی منظر نہیں ٹھہرا
جو منظر ہے مرے پیشِ نظر، طیبہ نگر کا ہے

جو حُسنِ مصطفائیؐ ہے، وہ عکسِ کبریائی ہے
ذرا سا فرق ہے، جو حُرمتِ فکر و نظر کا ہے

فرشتے ہر قدم صلّے علیٰ کا وِرد کرتے ہیں
مزا کچھ اور ہی آقا مدینے کے سفر کا ہے

مدینے کے گلی کوچوں میں پھرتا ہوں ہر اِک لمحہ
کہاں اندازہ مُجھ کو حلقۂ شام و سحر کا ہے

پَروں کو باندھ کے جبریلؑ رہتا ہے جہاں آصفؔ
جبیں کو شوقِ سجدہ بس اُسی اِک سنگِ دَر کا ہے

سلام

سورج کے پہلو میں دشتِ کربلا جب آگیا
جاں لرز اُٹھی مِری اور دِل مرا تھرا گیا

تا ابد روشن رہے گا وقت کے اوراق پر
حق کی خاطر خون سے جو فیصلہ لکھا گیا

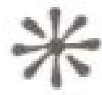
آج تک تابندہ و رخشندہ ہے نامِ حسینؑ
روشنی کا راستہ بھی کیا کبھی روکا گیا؟

مِل گیا ہے جس کو عرفانِ حسینؑ ابنِ علیؑ
وہ بشر صبر و قناعت کی حقیقت پا گیا

تشنگی اور حرمتِ شامِ غریباں ہے عجب
آنسوؤں کا ابر ارضِ شام تک پیاسا گیا

کچھ بتا اب تُو ہی ہم کو آسمانِ کج ادا
گلستانِ فاطمہؓ کو کِس لیے روندا گیا

آج تک فطرت کا چہرہ جگمگاتا ہے شفیق
آندھیوں کے سامنے ایسا دِیا رکھّا گیا



شبِ سیاہ میں خوابِ ہُنر کو زندہ رکھ
صلیبِ وقت پہ نقشِ سحر کو زندہ رکھ

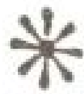
ہر ایک چیز تو پتّھر نہیں ہُوا کرتی
تُو اپنی آنکھ میں ذوقِ نظر کو زندہ رکھ

اگر نہیں کوئی سُورج، تو دِل کے آنگن میں
دیئے کی لَو میں لہُو کے سفر کو زندہ رکھ

ابھی سجانے ہیں گم گشتہ زندگی کے نقوش
رہِ حیات میں دستِ ہُنر کو زندہ رکھ

مُسافرانِ خرد لَوٹ کر بھی آئیں گے
حصارِ ذات کے دیوار و دَر کو زندہ رکھ

شفیقؔ حُسنِ طلب ایک چیز ہے لیکن
طلب میں حرفِ دُعا کے اثر کو زندہ رکھ



حق بیانی کے لیئے دُنیا میں تعزیریں عجب
زہر کے ساغر عجب مقتل کی زنجیریں عجب

دن چڑھا تو دفعتاً بینائیاں بھی چھن گئیں
خوابِ راحت کی ملی ہیں ہم کو تعبیریں عجب

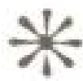
کیوں نہ ہم یہ آرزو کے خواب بُننا چھوڑ دیں
ہیں فقیروں کو میسّر غم کی جاگیریں عجب

خواہشِ بے رنگ ہے موہوم سا پیکر لیے
سج رہی ہیں دِل کے آئینے میں تصویریں عجب

پھر بھی چھٹکارا نہ مِل پایا تمھاری یاد سے
بچ نکلنے کے لِیے کیں یُوں تو تدبیریں عجب

ہم بھی اُن بھٹکے ہُوئے لوگوں میں شامل ہیں شفیق
راہِ اُلفت میں ہُوئی ہیں جن سے تقصیریں عجب

Scanned with CamScanner



ہے میرے دِل کے آئینے میں اِک تصویر مٹّی کی
مِرے مٹّی کے خوابوں کو، مِلی تعبیر مٹّی کی

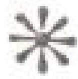
بھٹکتے پھر رہے ہیں ہم نہ جانے کن جزیروں میں
خود اپنے پاؤں میں ڈالے ہُوئے زنجیر مٹّی کی

تکلّف برطرف آنکھوں میں میری اِک ذرا جھانکو
وہاں تُم کو نظر آئے گی اِک تصویر مٹّی کی

اُبھرنا اور رنگوں میں اُتر آنا دھنک ہی کر
یہ اندازِ محبت ہے نئی تفسیر مٹی کی

مجھے اپنوں سے رہتا ہے شکستِ فاش کا خطرہ
مرے سب تیر مٹی کے مری شمشیر مٹی کی

محبت خاک کے پُتلوں کے دل بھی جوڑ دیتی ہے
شفیقؔ اپنی متاعِ زیست ہے جاگیر مٹی کی



وہ ہلا تو جانے کیوں اک شور سا برپا ہوا
بات معمولی تھی سارے شہر میں چرچا ہوا

چل رہی تھیں سارے جنگل میں ہوا کی برچھیاں
پاس ہی اِک جھونپڑی میں دیپ تھا جلتا ہوا

رات روتے تھے ستارے بیکسی پر جب مری
چاند کو دیکھا تھا میں نے جھیل میں ہنستا ہوا

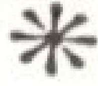
ساتھ کب دیتی ہیں شامِ دشت میں پرچھائیاں
ایسے عالم میں جدا وہ ہو گیا اچھا ہوا

لوگ کہتے ہیں جسے تصویرِ زخمِ آرزو
گلشنِ احساس میں اِک پھول ہے مہکا ہُوا

جانے کب اور کس جگہ سانسوں کو آزادی مِلے
دُور تک اِک سلسلہ ہے حبس کا پھیلا ہُوا

اِک کھلونے کی طرح انسانیّت کا ہے وجُود
شاہراہِ زندگی پر ٹُوٹ کر بکھرا ہُوا

میری آنکھیں رات دن بس اُس کی جانب ہیں شفیقؔ
ان خلاؤں سے پرے وہ کون ہے ٹھہرا ہُوا



محبّت کی کرشمہ سازیاں آواز دیتی ہیں
تری یادوں کی البڑ شوخیاں آواز دیتی ہیں

مُسافر لَوٹنا چاہو تو لمحوں میں پلٹ جاؤ!
تمھیں ساحل پہ ٹھہری کشتیاں آواز دیتی ہیں

ذرا سی دیر میں موسم بدلنے کا زمانہ ہے
ہَوا کے بازوؤں کی چُوڑیاں آواز دیتی ہیں

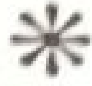
خزاں کے خوف سے سہمے پرندو! لَوٹ بھی آؤ
تمھیں پھر لہلہاتی ٹہنیاں آواز دیتی ہیں

پِچھلے جاتے ہیں ہم اپنا لہو ایندھن بنانے کو
دُھواں دیتی ہُوئی جب چمنیاں آواز دیتی ہیں

مَیں جب بھی شب کے دامن پر کوئی سُورج اُگاتا ہُوں
تِری سوچوں کی گہری بدلیاں آواز دیتی ہیں

ذرا سی دیر کو کُچھ شادماں لمحے عطا کر دو
ذرا سُننا! غموں کی تلخیاں آواز دیتی ہیں

شفیق احباب اکثر یاد آتے ہیں ہمیں اب بھی
ہَوا کے ساتھ بجتی تالیاں آواز دیتی ہیں



غموں سے دل بہلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
مجھے، گر کر سنبھلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

میں اپنی کھوج میں نکلا ہوا ہوں اک زمانے سے
مرا پیکر نکھرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

سفر موقوف کرنے کی ابھی خواہش نہیں جاگی
مرے دل کے ٹھہرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

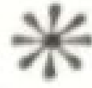
کلی سے پھول بننے کا عمل جاری نہیں ہوگا
اگر سورج نکلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

ابھی موسم کے ہاتھوں نے ہوا کے پر نہیں کھولے
کہ بُوئے گُل بکھرنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

جو ممکن ہو شفق سے شامِ غم کی داستاں سُن لیں
شبِ تیرہ اُترنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

فضا پر حکمرانی ہے ابھی تک حبس کی آصف
یقیناً رُت بدلنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے

Scanned with CamScanner



حریمِ شام کا منظر چمکتا ہے نگاہوں میں
یہ کِس کی یاد کا دریا مچلتا ہے نگاہوں میں

گُلابوں کے جزیرے میں اکیلے بیٹھ کر اکثر
تمھاری سوچ کا پیکر نکھرتا ہے نگاہوں میں

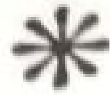
جسے ہم عُمر بھر دیکھا کیے اپنے خیالوں میں
وہی اِک نقش صدیوں کا بکھرتا ہے نگاہوں میں

مَیں جب بھی رتجگوں کی چاندنی میں رقص کرتا ہُوں
کِسی کا عکس چُپکے سے اُترتا ہے نگاہوں میں

وہ نازِ دل جہاں بھی ہو، قرارِ جاں ہی رہتا ہے
اُسی کا پھُول سا چہرہ مہکتا ہے نگاہوں میں

سحر کے لَوٹ آنے میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
ستارہ آخرِ شب کا دمکتا ہے نگاہوں میں

ہمارا خواب شاید ہو رہا ہے مُنکشف آصف
تمھارے خواب کا پَرتو اُبھرتا ہے نگاہوں میں



سر پہ سُلگتی دُھوپ تھی اور سائباں نہ تھا
دشتِ سفر میں ہم سا کوئی بے اماں نہ تھا

پھرتے رہے ہیں خانہ بدوشی میں عُمر بھر
اپنوں کے شہر میں کوئی اپنا مکاں نہ تھا

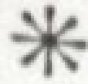
یہ سانحہ بھی کم تو نہیں راہِ زیست میں
منزل قریب تر بھی تھی مگر کارواں نہ تھا

تصویرِ ذات اپنی کوئی دیرپا نہ تھی
نقشِ کفِ خیال بھی کُچھ جاوداں نہ تھا

دِل میں اگرچہ درد کا طُوفاں تھا موجزن
چہرے سے پھر بھی کرب کا منظر عیاں نہ تھا

بچھڑیں گے تُم سے اس کا تو خدشہ رہا مگر
ترکِ تعلّقات کا وہم و گمُاں نہ تھا

آصفؔ شفق کی لَو پہ سُلگتے رہے وجُود
لیکن زمینِ غم کا کوئی آسماں نہ تھا



خود ہی رو کر گیت سُنانے لگتے ہیں
خود ہی خود کو ہم دیوانے لگتے ہیں

خود ہی خود کو کرتے ہیں ہم قتل یہاں
خود ہی اپنا سوگ منانے لگتے ہیں

خود ہی سُولی چڑھتے ہیں پچھتاوے کی
خود ہی اپنا من پرچانے لگتے ہیں

خود ہی چہرہ چہرہ چُنتے ہیں خود کو
خود ہی سارے نقش مٹانے لگتے ہیں

خود ہی پُھلجھڑیوں کے کھیل کو کھیلیں ہم
خود ہی خود کو آگ لگانے لگتے ہیں

خود ہی دیپ جلا کر اس کی یادوں کے
خود ہی درد کا شہر بسانے لگتے ہیں

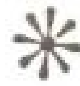
خود ہی ہٹ جاتے ہیں سوچ دریچے سے
خود ہی اس میں آنے جانے لگتے ہیں

خود ہی گُم کرتے ہیں خود کو لمحوں میں
خود ہی اپنا کھوج لگانے لگتے ہیں

خود ہی شکوہ کرتے رہتے ہیں دِل کا
خود ہی خود کو پھر سمجھانے لگتے ہیں

خود ہی اِک تصویر مٹاتے ہیں دِل سے
خود ہی وہ تصویر بنانے لگتے ہیں

خود ہی آصفؔ لکھتے ہیں تعبیریں ہم
خود ہی اپنے خواب چُرانے لگتے ہیں



حرف تھا آصف جو زیبِ داستاں گُم ہو گیا
ہم زمیں والوں کا گویا آسماں گم ہو گیا

ذہن پر سُورج اُتر آیا ہے تیری یاد کا
اتنی حدّت ہے کہ ربطِ جسم و جاں گُم ہو گیا

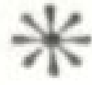
اُن سے پُوچھیں گے بدلتے موسموں کی سرگزشت
دُھوپ کے صحرا میں جن کا سائباں گم ہو گیا

کچھ ہمیں تو ہی بتا اے زندگی! اِس موڑ پر
تیری راہوں میں نشانِ کارواں گم ہو گیا

کیا کرے گا رہروانِ شوق کی وہ رہبری
رہزنوں کی بھیڑ میں جو پاسباں گم ہو گیا

ان دِنوں گم ہے بھلا تو کن دیاروں میں شفیقؔ
میں تو اپنے دوستوں کے درمیاں گم ہو گیا

Scanned with CamScanner



ہو نہ جائے زندگی کا عکس بھی معدوم پھر
کر رہا ہوں حادثاتِ آرزو مرقوم پھر

ظُلمتوں کا زہر اُترا تھا جو لمحوں میں کبھی
ہو گیا ہے روشنی کے نام سے موسوم پھر

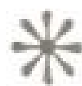
جس کے بام و دَر کِئے تھے مَیں نے روشن، خون سے
لِکھ رہا ہے تیرگی سے وہ مرا مقسوم پھر

عُمر بھر جس نے کِیا ہے چاہتوں کا قتلِ عام
پوچھتا ہے اب محبّت کا وہی مفہوم پھر

ایک مدت تک جو میری ذات سے غافل رہا
کر رہا ہے وہ مرے حالات کو معلوم پھر

ہو سکے تو نوکِ خنجر سے نئی تاریخ لکھ
وقت کہتا ہے فرازِ دار کو اب چوم پھر

جب سے اُتری ہے مری آنکھوں میں ماضی کی کرن
جاگتی ہے دل میں آصف خواہشِ موہوم پھر



دوستی میں دشمنی کا ڈر تو وا ہونا ہی تھا
آخر اک دن شہر میں یہ حادثہ ہونا ہی تھا

تھا ہمیں شیشہ گروں کے قرب میں رہنے کا شوق
آئینہ تھے، پتھروں کا سامنا ہونا ہی تھا

پَر اگر ہوں کون رہتا ہے قفس کے حبس میں
اپنی سانسوں کے پرندوں کو رہا ہونا ہی تھا

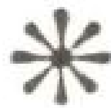
Scanned with CamScanner

چُن لیے تھے ابتدا میں اپنے اپنے راستے
اس مُسافت میں ہمیں اِک دن جُدا ہونا ہی تھا

ڈھونڈتے پھرتے ہو کس کو گُلستاں در گلستاں
وہ تو خوشبُو تھا اُسے صرفِ ہَوا ہونا ہی تھا

ہم کہ آوازوں کے سائے ساتھ رکھتے تھے بہت
اس حریمِ جاں کو آصفؔ بے صدا ہونا ہی تھا

Scanned with CamScanner



دِل اُس کی تمنّا کا سزاوار ہُوا تو
وہ میرے لیے باعثِ آزار ہُوا تو

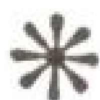
صحرا کے تناظر میں جو بادل کی طرح ہے
وہ شخص اگر سایۂ دیوار ہُوا تو

رستہ بھی کوئی ہم کو دکھائی نہ پڑے گا
لمحوں کا تسلسل جو گراں بار ہُوا تو

ہم سوچیں گے کچھ اور سُلگنے کا طریقہ
دِل سوز کی لذّت سے جو بیزار ہُوا تو

دِل میں جو لِئے پھرتے ہیں جذبات کا دریا
آنکھوں سے اگر اپنی شرر بار ہُوا تو

جس شہر سے آصفؔ ہمیں اُمیدِ سکوں ہے
وہ شہر اگر وقت کی رفتار ہُوا تو



تیری سوچوں پہ تو نفرت کا فسوں طاری ہے
میرا شیوہ تو محبّت کی شجر کاری ہے

جس نے سیکھا تھا تکلّم کا قرینہ مُجھ سے
میرے لہجے سے وہ اِک شخص بھی انکاری ہے

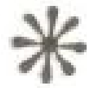
اُس نے ڈالی ہے مری ذات پہ غفلت کی رِدا
پھر بھی آنکھوں میں مری، صُبح کی بیداری ہے

Scanned with CamScanner

ہم نے اوڑھی نہیں رستے کی تھکن جسموں پر
منزلیں دُور سہی پھر بھی سفر جاری ہے

جیتنا تیرا مقدّر تو نہیں تھا جاناں
مَیں نے جیتی ہوئی بازی بھی مگر ہاری ہے

اِس میں شامل ہے مِرے خُون کی خوشبُو آصف
یہ جو گلشن میں کئی رنگ کی پھلواری ہے



جو اپنی آنکھ میں چاہت کے خواب رکھتے ہیں
دُرونِ ذات وہ کیا کیا عذاب رکھتے ہیں

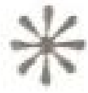
گرے ہُوئے ہیں وہی ظلمتوں کے دریا میں
جو اپنی سوچ میں صد آفتاب رکھتے ہیں

بھٹکتے رہتے ہیں تشنہ لبی کے صحرا میں
نظر نظر میں جو حدِّ سراب رکھتے ہیں

لہو لہو ہے اُنھیں سے چمن کا پیراہن
جو اپنے ہاتھ میں شاخِ گُلاب رکھتے ہیں

تمھاری یاد کی سرگوشیوں کو بکھرا کر
نوائے درد کا ہم بھی جواب رکھتے ہیں

وہی نقیب ہیں آصفؔ نئے زمانے کے
گئی رُتوں کا جو ہر دم حساب رکھتے ہیں



پہلے اپنے خون میں پھیلی ہوئی نفرت نکال
پھر محبت کے حوالوں میں کوئی وسعت نکال

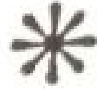
تیرگی کے زہر میں ڈھل جائے نہ تیرا وجود
جس طرح ممکن ہو شہرِ ذات سے ظلمت نکال

زندگانی کا تقاضا ہے دلِ بے تاب سُن
کربلائے دہر میں جینے کی کچھ صورت نکال

منزلیں ہیں منتظر اے راہرِو دشتِ وفا
فکر کا تیشہ اُٹھا اور آنکھ سے حیرت نکال

پھر کہیں بن جائے شاید آبروئے زندگی
ہر خرابی کے اُفق سے پہلوئے زینت نکال

کاٹ دے تیغِ ستم کو پھر رگِ جاں سے شفیقؔ
جبر کے زندان سے اِنسان کی حُرمت نکال



وقت کی بے نام گزری ساعتوں میں قید ہوں
شہرِ احساسات کے کن منظروں میں قید ہوں

کب تلک بھٹکوں گا میں نادیدہ منزل کے لیے
کیا مسافت ہے، سفر کے وسوسوں میں قید ہوں

سوچ کے صحرا میں اکثر بے طلب رہتا ہوں میں
جانے کیسی خواہشوں کے جنگلوں میں قید ہوں

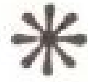
دشمنوں کی دشمنی کا ذکر بے معنی سا ہے
میں تو اپنے دوستوں کی سازشوں میں قید ہوں

مُنقسم ہے کرب کے ماحول میں میرا وجُود
مَیں شکستِ خواب ہُوں اور رتجگوں میں قید ہُوں

صُبح کا سُورج دلائے گا رہائی لازماً
کیا ہُوا اگر میں ابھی تک ظلمتوں میں قید ہُوں

غور سے کیا دیکھتا مَیں شہر کے منظر شفیقؔ
دیدہ ور ہُوں اور اپنے آنسوؤں میں قید ہُوں

Scanned with CamScanner



خُوں اپنا پلانا ہے، اور خُوب پلانا ہے
اے تشنہ لبی تیرا، ہر قرض چکانا ہے

دل کی بھی لہُو نہریں، گرتی ہیں بہیں آکر
یہ آنکھ دہانہ بھی، دریا کا دہانہ ہے

اب موت یقینی ہے، اس جبرِ مسلسل کی
وہ اُس کا زمانہ تھا، یہ میرا زمانہ ہے

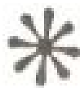
جذبوں کے چراغوں کو، ہم اپنا لہُو دیں گے
اس دَور کی ظلمت کو، ہر طور مٹانا ہے

اِک عُمر کی سوچوں نے، تخلیق کِیا جس کو
چھوٹی سی کہانی ہے، چھوٹا سا فسانہ ہے

اِک چہرہ بناؤں گا، مَیں لوحِ تمنّا پر
پھر لوحِ تمنّا سے، اِک چہرہ مٹانا ہے

یہ شام کا منظر بھی، ہے کتنا عجب آصف
بُجھتی ہُوئی آنکھوں میں، سُورج کا زمانہ ہے

Scanned with CamScanner



ریگِ دل پر جو تری یاد کے آہو آئے
میری پلکوں پہ مچلتے ہوئے جگنو آئے

حُسنِ اظہار عطا کر مجھے اے ربِّ ہنر
میرے لفظوں سے مہکتی ہوئی خوشبو آئے

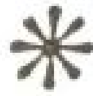
میں نے چپکے سے ترے ذہن کی تختی پڑھ لی
میرے شعروں میں تری سوچ کے پہلو آئے

مَیں بھی ہو جاؤں کبھی گامزنِ راہِ سلوک
کاش ہونٹوں پہ مِرے نعرۂ باہو آتے

لوگ مشکیزہ لِئے پھر سُوئے دریا لپکے
کام جس مرحلہ میں اِک شخص کے بازو آئے

اپنے آئینِ تمنّا کا بھرم رکھ آصف
یہ نہ ہو لمحۂ تفریقِ من و تُو آئے

Scanned with CamScanner



اُس کے لہجے سا کہیں بھی بانکپن مِلتا نہیں
گُل رُخوں کی بھیڑ میں وہ گُلبدن مِلتا نہیں

جس کی خوشبو کے تعاقب میں ہے تنہائی کی شام
انجمن میں بھی وہ جانِ انجمن مِلتا نہیں

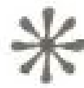
مِل تو جاتی ہے دکھاوے کی شناسائی بہت
اس جہاں میں پیار لیکن قیمتاً مِلتا نہیں

جب سے اُترا ہے گُلوں پر زرد موسم کا عذاب
ہم کو سارے گلستاں میں خوش سُخن ملتا نہیں

کب سے اپنی خواہشوں کے بَن میں آوارہ ہُوں میں
میری سوچوں کو صدا کا پیرہن ملتا نہیں

شخصیّت سازی میں بھی کچھ وقت لگتا ہے شفیق
مرتبہ ملتا ہے، لیکن دفعتاً ملتا نہیں

Scanned with CamScanner



تھا جو پیکر عالمِ تمثیل میں
آ گیا ہے چشمِ تر کی جھیل میں

میرے دِل کا پُوچھتے ہیں مُجھ سے آپ
میرا دِل ہے آپ کی تحویل میں

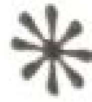
جس کی سانسوں میں ہے خوشبوئے وصال
ہے وہ منظر لمحۂ تکمیل میں

آپ جو چاہیں روا رکھیّں سلوک
سر بہ سر حاضر ہیں ہم تعمیل میں

جانے کیوں اِس دَور کا ہر آدمی
محو ہے اِنسان کی تذلیل میں

بات اُن سے مختصر کیجئے شفیقؔ
پڑ رہے ہو کس لِئے تفصیل میں

Scanned with CamScanner



محبتوں کا مری جاں کوئی حساب نہیں
مرا وجُود ہے تُو میرا انتخاب نہیں

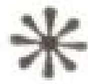
عجیب رنگ خد و خال میں گھُلا اپنے
تری مثال نہیں ہے مرا جواب نہیں

جمی ہُوئی ہیں طنابیں وفا کے خیموں کی
ہوائے دشت میں پہلا سا اضطراب نہیں

نجانے کون سے موسم کی ہیں اسیری میں
صبا کے ہاتھ میں اب کوئی بھی گُلاب نہیں

کتابِ درد کے بے نام سے حوالوں میں
ہمارا نام تو ہے ، حرفِ انتساب نہیں

کھُلی جو آنکھ تو سب ہم پہ کھُل گیا آصف
عذابِ خواب سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں



بحرِ غم کا کٹاؤ کیسا ہے
آنسوؤں کا بہاؤ کیسا ہے

ہم تو رہتے ہیں قریۂ غم میں
حال اپنا سناؤ کیسا ہے

جس سے بچھڑے ہمیں زمانہ ہُوا
وہ شناسا بتاؤ کیسا ہے

تُم کہ مردم شناس تھے اتنے
پھر یہ سینے پہ گھاؤ کیسا ہے

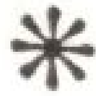
Scanned with CamScanner

اُس سے کھا کر فریب اُس کا ہُوں
جانے اُس سے لگاؤ کیسا ہے

میرے الفاظ میں تمہارے لِئے
چاہتوں کا رچاؤ کیسا ہے

تُم جو اتنے انا کے داعی تھے
اُس کی جانب جھکاؤ کیسا ہے

سارے جذبے جُھلس گئے آصف
میرے اندر الاؤ کیسا ہے



زندگی کی رہگزر ہو اور تُو ہو
اور نہ کوئی ہمسفر ہو اور تُو ہو

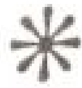
چاند میرے رتجگوں کا آئینہ ہے
آج پھر وہ جلوہ گر ہو اور تُو ہو

تیرا پیکر ہو نظر کی دسترس میں
ایک میری چشمِ تر ہو اور تُو ہو

ختم بھی ہو رہگزاروں کی مُسافت
کاش اپنا کوئی گھر ہو اور تُو ہو

مُوئے خامہ خود تراشے خال و خد کو
کوئی ایسا بھی ہُنر ہو اور تُو ہو

گفتگو کے پھُول جاگیں آج آصفؔ
میرے لفظوں میں اثر ہو اور تُو ہو



ضبط کی گہرائی سے حرفِ بیاں تک آ گئے
رفتہ رفتہ دِل کے افسانے زباں تک آ گئے

چھا گئی ہے پھر تری یادوں کی بدلی آنکھ پر
برف جذبے آج پھر اشکِ رواں تک آ گئے

آندھیوں کی زد میں اب گُل پیرہن بھی آئیں گے
کچھ بگولے پھر فصیلِ گلستاں تک آ گئے

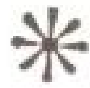
یہ جو برگد میں اُداسی ہے اِسے تُم ڈھونڈنا
شام کو جس دم پرندے آشیاں تک آ گئے

آدمی اپنی تباہی کی طرف ہے گامزن
ہم چلے تھے کس طرف لیکن کہاں تک آ گئے

کون سے رُخ پر بہی جاتی ہے کشتی سوچ کی
بپھری موجوں کے تھپیڑے بادباں تک آ گئے

اب تو اپنی ذات کے پاتال میں اُتریں شفیق
دُھوپ کے بے رحم نیزے سائباں تک آ گئے

Scanned with CamScanner



بینائی کھو رہی ہے لمحوں کی تیرگی سے
ماحول کو اُجالیں سوچوں کی روشنی سے

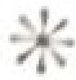
اس دَورِ پُرفتن میں حیوان بن گیا ہے
فطرت کو جانے کیا تھی اُمّید آدمی سے

منزل نے تو پکارا ہم کو قدم قدم پر
بھٹکے رہے مگر ہم اپنی ہی کج روی سے

رکھتے ہیں سامنے ہم اُلفت کے سب قرینے
کرتے ہیں یاد تجھ کو اے دوست خامشی سے

ہم مفلسوں کی یُوں بھی بے کار ہے جوانی
راحت کِسے ملی ہے سرما کی چاندنی سے

سمٹے ہیں فاصلے بھی یُوں تو شفیق آصف
پھر دُور ہو گیا ہے اِنسان زندگی سے



گر محبّت عطا کرے کوئی
دِل کی خواہش، ہلا کرے کوئی

دِل میں اُتروں گا صُورتِ خُوشبُو
ہاں! دریچہ تو وا کرے کوئی

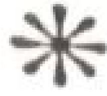
قید ہُوں کب سے چُپ کے گُنبد میں
مجھ میں آئے، صدا کرے کوئی

کون رُسوا ہے اُس کی گلیوں میں
ہم کو کیا ہے، ہُوا کرے کوئی

آئنے عکس کے ہیں متلاشی
شاخِ گل پر کھلا کرے کوئی

زرد موسم رواں ہوا دل میں
زخمِ جاں کو ہرا کرے کوئی

مثلِ خورشید، زیست کو آصف
ظلمتوں سے رہا کرے کوئی



دِل کی دُنیا کا پاسباں کہہ دوں؟
تجُھ کو تسکینِ رُوح و جاں کہہ دوں؟

جو تری یاد میں نہیں گُزرے
ایسے لمحوں کو رائیگاں کہہ دوں؟

جو تری رہگزر میں آتے ہیں
ایسے ذرّوں کو کہکشاں کہہ دوں؟

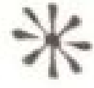
روک لیتے ہیں دُھوپ کی حدّت
بادلوں کو مَیں سائباں کہہ دوں؟

وہ جو تاریخ کا حوالہ ہیں
اُن کو آوازِ رفتگاں کہہ دوں ؟

آپ کیا میرا راز رکھ لیں گے ؟
آپ کو اپنا راز داں کہہ دوں ؟

رُو برُو ہیں وہ اب شفیقؔ آصف
زندگی کو مَیں جاوداں کہہ دوں ؟

Scanned with CamScanner



اپنے کئی پیکر ہیں پرائے کئی پیکر
احساس کی دُنیا میں بسائے کئی پیکر

جب آنکھ دریچے میں کوئی عکس نہ اُترا
پھر ہم نے تخیّل میں بنائے کئی پیکر

ہے سلسلہ در سلسلہ تعبیرِ محبّت!
سوئے ہُوئے خوابوں سے جگائے کئی پیکر

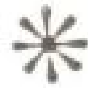
جب لوحِ تمنّا پہ بنایا ترا چہرہ
پھر لوحِ تمنّا سے مٹائے کئی پیکر

جس وقت میں پہنچا تھا سرِ کوچۂ قاتل
رہ رہ کے مِرے سامنے آئے کئی پیکر

پھر دشتِ تحیّر سے ترا نقش ملا ہے
پھر دشتِ تحیّر سے اُٹھائے کئی پیکر

جب یاد کیا اُن کو کبھی خواب میں آصفؔ
پھر خواب جھروکوں میں بھی آئے کئی پیکر

Scanned with CamScanner



جب سُورج نے اوڑھا بادل
برسا دریا دریا بادل

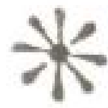
ہم بھی روئے وہ بھی رویا
ساتھ ہمارے رویا بادل

خوابوں کی دہلیز پہ ہم نے
دیکھا سویا سویا بادل

جب آنکھوں نے سپنے دیکھے
پھر پلکوں نے لکھا بادل

جانے کیوں اچھا لگتا ہے
گیسو گیسو پھیلا بادل

جب آصفؔ میں گھر سے نکلا
ساتھ مرے چل نکلا بادل



دشت کی جانب ہم کو نکلے ایک زمانہ بیت گیا
اپنے شہر کے منظر دیکھے ایک زمانہ بیت گیا

تُو ہی میری سوچوں اور شعروں کا محور ہوتا ہے
تیری یاد میں غزلیں کہتے ایک زمانہ بیت گیا

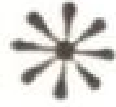
اور بھی کوئی صُورت نکلے دل کی باتیں کہنے کو
دیواروں پہ لکھتے لکھتے ایک زمانہ بیت گیا

دِل کو دل سے رہ کب ہو گی کب جذبے مُسکائیں گے
درد کے رستے چلتے چلتے ایک زمانہ بِیت گیا

اُن سے بھلا کیا غُنچہ و گُل کی، بادِ صبا کی بات کریں
جن کو اپنی آگ میں جلتے ایک زمانہ بِیت گیا

جانے کب پہچانیں گے ہم آصفؔ اپنی منزل کو
وقت کی موج میں بہتے بہتے ایک زمانہ بِیت گیا

Scanned with CamScanner



دوستوں میں کہ دشمنوں میں ہیں
ہم زمانے کی گردشوں میں ہیں

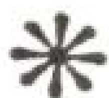
ہجرتیں ہم کو راس آتی تھیں
اب پریشاں بھی ہجرتوں میں ہیں

کُچھ تو بکھرے تھے شب کے دامن پر
اور کُچھ خواب رتجگوں میں ہیں

کتنے چہرے تھے زینتِ محفل
کتنے چہرے جو آئینوں میں ہیں

ہیں یقیناً وہ منزلوں کے نقیب
جو مُسافر کہ راستوں میں ہیں

تیرے جانے کے بعد اے آصفؔ
اِک زمانے سے وحشتوں میں ہیں



زندگی کے خمار سے گُزرے
جب ترے انتظار سے گُزرے

تم نے دیکھا نہیں سرِ مقتل
لوگ کتنے وقار سے گُزرے

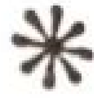
ایسے گُزرے ہم اپنی ہستی سے
پھُول جیسے بہار سے گُزرے

کتنے چہرے تھے گرد سے عاری
قافلے تو غبار سے گزرے

آئنے چاند صورتیں لے کر
چاہتوں کے شمار سے گزرے

ہم بھی شامل تھے اُن میں اے آصف
جیت کر بھی جو ہار سے گزرے

Scanned with CamScanner



زندگی تیرا اثر اچھا لگا
ہم کو لفظوں کا ہُنر اچھا لگا

چاند سی کچھ صورتوں کے باوجود
اِک ستارہ بام پر اچھا لگا

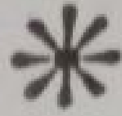
آج اس نے غور سے دیکھا مجھے
آج یہ حُسنِ نظر اچھا لگا

آئینے میں اُس ضیا پیکر کے ساتھ
اپنا چہرہ دیکھ کر اچھا لگا

اُس کی یادیں ہر قدم تھیں ساتھ ساتھ
یوں صعوبت کا سفر اچھا لگا

جس کے ہونے سے تھی زخموں پر بہار
ہم کو آصف عمر بھر اچھا لگا

Scanned with CamScanner



نظر در نظر یُوں تو چہرے بہت ہیں
مگر کیسے کہہ دوں کہ تجھ سے بہت ہیں

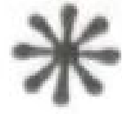
یہ کس برف پیکر نے تجُھ کو چھُوا ہے
بتا کیوُں ترے ہاتھ ٹھنڈے بہت ہیں

کبھی ہم نشیں تھے، زمانے ہمارے
مگر آج کل ہم اکیلے بہت ہیں

کوئی بھی جواب اُس طرف سے نہ آیا
اگرچہ خطوط اُس کو لکھے بہت ہیں

ابھی تشنہ لب ہیں مرے دل کے جذبے
فراتِ تمنّا پہ پہرے بہت ہیں

الگ بات بچتے رہے یار آصفؔ
کمیں گاہ سے تیر آئے بہت ہیں



آنکھ میں کیسا سپنا جاگا
جذبوں کا اِک دریا جاگا

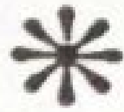
نیندیں اوڑھ کے سوئے سارے
اور مَیں شب بھر تنہا جاگا

نیند میں گُم تھے جب ہمراہی
ساتھ ہمارے رستہ جاگا

شب بھر ہم کو نیند نہ آئی
دل میں درد اِک ایسا جاگا

کیا کرتیں تدبیریں اپنی
بخت ہی رفتہ رفتہ جاگا

گلشن جب مدہوش تھا آصف
شاخ سے گرتا پتّہ جاگا



تیرے لَوٹ آنے کی، یہ بھی اِک نشانی ہے
موسموں کے ہونٹوں پر، پیار کی کہانی ہے

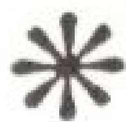
اصل میں ستارہ ہے، حسرتوں کے صحرا کا
یہ جو میری آنکھوں میں، جھلملاتا پانی ہے

یہ جو تیری آنکھوں میں، عکس ہے گُلابوں کا
یہ بھی میرے شعروں کی، بیکراں جوانی ہے

زندگی کے بارے میں ، بات ہے تو اِتنی سی
صُبح کا فسانہ ہے ، شام کی کہانی ہے

میرا خُوں بھی شامل ہے، میرے سارے حرفوں میں
موج میں طبیعت ہے، سوچ میں روانی ہے

آدمی کو اَب کیسے، مَیں خُدا کہوں آصفؔ
بے ضمیر لوگوں سے، دُشمنی پُرانی ہے



ہر ایک شاخِ چمن زار پر نکھار آیا
خزاں کا دور گیا عہدِ نَو بہار آیا

کسی کے لمس کی خوشبو ہے مری سانسوں میں
حریمِ جاں میں مری کون مشکبار آیا

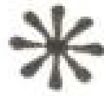
میں سوچتا رہا اکثر کہ تجھ سے پوچھوں گا
مری طرف سے ترے دِل میں کیوں غبار آیا

یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں یارب
تری خدائی میں کیا دورِ انتشار آیا ؟

تمھارے شہر کی بے کیف محفلوں کی قسم
میں بے قرار گیا اور بے قرار آیا

جو صورتیں مرے دل میں بسی ہوئی تھیں شفیق
قلم سے صفحۂ قرطاس پر اُتار آیا

Scanned with CamScanner



جب ہم شفیقِ واقفِ جذبات ہو گئے
آنکھوں میں اُن سے کتنے سوالات ہو گئے

لکھّے ہوں جیسے میں نے ترے دل پہ سب حروف
مُجھ ایسے آج تیرے خیالات ہو گئے

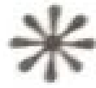
کل تک تھا جن کو میرے مُوقف سے اختلاف
پھر یُوں ہُوا کہ وہ بھی مرے ساتھ ہو گئے

جانے یہ آج کس کی دُعائیں ہیں ساتھ ساتھ
حیراں ہُوں آج کتنے مِرے ہاتھ ہو گئے

ہر شخص اپنی ذات میں تنہا ہے ان دنوں
کچُھ ایسے اپنے شہر کے حالات ہو گئے

اَب ڈھونڈتا ہے اُن کو کہاں، کس لئے شفیق
جو لوگ تجُھ سے مِل کے تیری ذات ہو گئے

Scanned with CamScanner



جو سُود و زیاں کو کبھی دیکھا نہیں کرتے
وہ لوگ وفاؤں کو تماشا نہیں کرتے

عُشّاق کی چاہت کا یہی پہلا سبق ہے
تفریق محبّت میں گوارہ نہیں کرتے

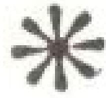
آجائے جنھیں کارِ محبّت کا قرینہ
رُسوا تو وہ ہو جاتے ہیں رُسوا نہیں کرتے

سوچوں میں بپا رہتا ہے یادوں کا تلاطم
آنکھوں کو مگر صورتِ دریا نہیں کرتے

ہو جائے اگر جن سے کبھی دل کا تعلّق!
بچھڑیں گے کبھی اُن سے، یہ سوچا نہیں کرتے

واقف ہُوں ہواؤں کی شکستوں سے جو آصف
وہ نام کبھی ریت پہ لکھا نہیں کرتے

Scanned with CamScanner



مِلن رُت کو دِل سے نکالا نہیں ہے
ابھی غم کو سانچے میں ڈھالا نہیں ہے

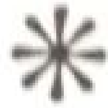
اندھیرے جہالت کے طاری ہیں ہر سُو
جہاں میں ابھی تک اُجالا نہیں ہے

یہاں آدمی ، آدمی کا ہے دُشمن
یہ انسانیت کا حوالہ نہیں ہے

تصوّر ترے حُسن کا ہے ازل سے
مَیں کیسے کہوں دیکھا بھالا نہیں ہے

بہت کیف پرور ہے تیرا تبسّم
مگر یہ غموں کا ازالہ نہیں ہے

نہ اُجلا سہی تیرے آصفؔ کا چہرہ
یہ کم ہے، کہ دِل کا وہ کالا نہیں ہے



کوئی بھی تجھ سا یہاں شہر میں قاتل نہ ہُوا
یعنی پتھر ہُوا سینے میں ترے، دِل نہ ہُوا

یادِ رفتہ کے زمانے سے بھی قائل نہ ہُوا
وہ کسی طور بھی پہچان پہ مائل نہ ہُوا

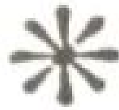
یہ الگ بات زبانوں پہ رہے ہیں پہرے
باوجُود اس کے بھی لہجہ مِرا زائل نہ ہُوا

گامزن قافلے جذبوں کے رہے جس کے لئے
پیار کی راہ میں وہ بھی مری منزل نہ ہُوا

میرے جذبوں کے سوا طرزِ نگارش میں مری
کوئی مانگا ہُوا لہجہ کبھی شامل نہ ہُوا

تجھ میں وہ کون سے جوہر تھے نہ جانے آصفؔ
تیرا دُشمن جو ترے مدِّ مقابل نہ ہُوا

Scanned with CamScanner



اب فصیلِ تیرگی میں در اُٹھانا چاہیئے
شب کے آنگن میں کوئی سُورج اُگانا چاہیئے

چل رہی ہوں جس جگہ پر نفرتوں کی آندھیاں
ایسی بستی سے مُسافر لوٹ جانا چاہیئے

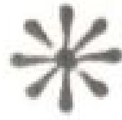
جو علامت ہو بہارِ جانفزا کے رنگ کی
پھُول اِک ایسا بھی کالر میں سجانا چاہیئے

جس جگہ سجدوں کو مِل جاتی ہے منزل عشق کی
ایسے سنگِ در پہ اپنا سر جھکانا چاہیئے

خُود نمائی کے ہیولوں کو سرِ راہِ طلب
جو ہُنر اہلِ وفا کا ہے سکھانا چاہیئے

ساتھ کچھ لمحات کا ممکن نہیں ہے اے شفیقؔ
چند رشتوں کو بنانے میں زمانہ چاہیئے

Scanned with CamScanner



جھیلنا ہے وقت کے طوفان کو تنہا مجھے
بہہ رہا ہے اپنے کاندھوں پر لیئے دریا مجھے

مجھ کو اپنے آپ سے ہے بے نیازی کا گلہ
مل گیا ہے زندگی میں حسنِ بے پروا مجھے

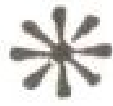
سو رہا تھا میں تو شامِ غم کی نیندیں اوڑھ کر
کر گیا بیدار کس کی یاد کا جھونکا مجھے

Scanned with CamScanner

کب ترے معیار پر پُورا نہیں اُترا ہوں مَیں
رہگزارِ زیست میں تُو نے جہاں پرکھا مُجھے

آخری سانسوں کا میری اُنگلیوں میں ہے قلم
اس نے اپنے آخری خط میں یہی لکّھا مُجھے

جانے کیسی تشنگی تھی اُس کی آنکھوں میں شفیق
دیکھتے ہی دیکھتے وہ کر گیا صحرا مجھے



دِل کا ہُوا حساب غمِ رُوزگار سے
باہر نکل کے دیکھ دُکھوں کے حصار سے

اس طرح اپنی ذات میں تنہا ہے آدمی
بچھڑی ہو جیسے کُونج کوئی اپنی ڈار سے

حالانکہ عشرتوں کا زباں در زباں ہے ذکر
کیا جانے پھر بھی لوگ ہیں کیوں سوگوار سے

زر کے بُتوں کو پُوجنے والو ذرا سنو !
تُم کچھ نہ پاسکو گے وفا کے دیار سے

ہے دشتِ آرزُو میں مری سوچ اِس طرح
بکھرا ہو جیسے پھُول ہوائے بہار سے

آصفؔ جنُوں کی تُند ندی میں اُتر کے دیکھ
دامن ہے گرد گرد خرد کے غبار سے



پیاسوں کی زندگی میں بَلا کے عذاب تھے
دریا جو سامنے تھے وہ سارے سراب تھے

کرتا شُمار کون سِتم آسمان کے!
کیسا حساب! رنج و الم بے حساب تھے

خرگوش طبع راہ میں سوتے ہی رہ گئے
اور جو رواں دواں تھے وہی کامیاب تھے

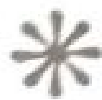
Scanned with CamScanner

جو آگ کی تلاش میں پہنچا تھا طُور پر
اُس کی ہتھیلیوں پہ کئی آفتاب تھے

اے کاش سطحِ آب سے اندازہ کرتے ہم
طوفانِ تیز و تُند کئی زیرِ آب تھے

خوشبُو ہے اُن کی آج بھی احساس میں شفیقؔ
وہ بے نقاب چہرے جو مثلِ گلاب تھے

Scanned with CamScanner



ہماری پیاس کو دہکا گیا ہے
تمھارے ساتھ جو دریا گیا ہے

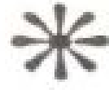
تمھاری نفرتوں کے وار سہہ کر
محبّت کا قرینہ آگیا ہے

تمھیں کیوں تشنگی سے خوف آئے
ہمارے ساتھ ہی صحرا گیا ہے

سُنا ہے نام تیرا اور میرا
ہَوا کے ہاتھ پر لکھا گیا ہے

پگھلنے لگ گئے ہیں موم پیکر
"سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے"

مہکتا تھا جو دشتِ جاں میں آصف
ہوائے سرد سے مرجھا گیا ہے



ہر سُو تنہائی کے تارے روتے تھے
رات گئے جب گھر کو واپس لَوٹے تھے

آخر اپنی بینائی تو چھننی تھی!
روشنیوں کے خواب جو ہم نے دیکھے تھے

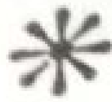
خُود ہی دفن کیا تھا اپنی لاشوں کو
خُود ہی ہم نے اپنے نوحے لکھّے تھے

جانے کِس جانب سے آندھی آئی تھی
جانے کتنے پتّے شاخ سے ٹوٹے تھے

اَب اِس کی بربادی پر یہ رونا کیا
جیسی بستی! ویسے ہی رکھوالے تھے

جن کی کھوج میں بھٹکے تھے ہم مدّت تک
جانے کیسے وہ گمنام جزیرے تھے

جن کو ماضی کی یادیں دُہراتی ہیں
میری مٹّھی میں آصفؔ وہ لمحے تھے



آئینہ جس نے توڑ ڈالا تھا
اپنی بے چہرگی سے ڈرتا تھا

دستکیں خواب میں جو دیتا تھا
اک شگفتہ ہوا کا جھونکا تھا

دِل میں آوازِ درد اُتری تھی
مَیں حصارِ اَنا سے نِکلا تھا

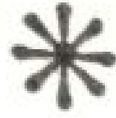
پیاس ہونٹوں پہ جم گئی اُن کے
رُوبرو جن کے بہتا دریا تھا

دُھوم تھی شہر میں بہاروں کی
صحنِ گلشن میں رنگِ صحرا تھا

تشنہ دھرتی نہ ہو سکی سیراب
بارہا گرچہ ابر برسا تھا

ہم مِلے تھے شفیق آصف سے
تیری یادوں میں شعر کہتا تھا

Scanned with CamScanner



کُچھ ایسا زندگی کا ستارا مُجھے ملا
اِک بار جو ملا وہ دوبارہ مُجھے ملا

تنہائیوں کی شام ملی جب کبھی مُجھے
پھر تیری یاد کا ہی سہارا مُجھے ملا

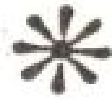
بے اختیار، ہنستی ہیں آنکھوں کی پُتلیاں
تُو آرہا ہے اِس کا اشارہ مُجھے ملا

Scanned with CamScanner

پھلنے لگی تھی ذہن پہ جب برف کی رِدا
تیرا خیال بن کے شرارہ مجھے ملا

تُم مِل گئے تو ساحلِ اُمّید بن گیا
ہر موجِ تُند خُو میں کنارا مجھے ملا

سب کچھ لُٹا کے پھر بھی ہُوں میں شادؔ اے شفیق
یہ کیسا چاہتوں میں خسارہ مجھے مِلا



وہ اندھیرے ہیں یا اُجالے ہیں
سارے لمحے ترے حوالے ہیں

بندگانِ وفا نے دانستہ
آستینوں میں سانپ پالے ہیں

طائرِ فکر کس فضا میں اُڑے
پَر فضاؤں نے کاٹ ڈالے ہیں

آج سُورج ہے قید میں شاید
آج بادل سروں پہ کالے ہیں

کج روی، افتراق و محرومی
سب اِسی عہد کے حوالے ہیں

کیسا آذر ہے وقت بھی آصفؔ
جس نے دل پتھّروں میں ڈھالے ہیں



اس ادا سے بھی دِلربائی کر
میرے زخموں کی رُونمائی کر

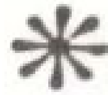
ٹُوٹ جائے نہ رسمِ اہلِ وفا
ہر کسی سے نہ آشنائی کر

محوِ آئینۂ خیال کبھی
میرے جذبات تک رسائی کر

مہر و اخلاص کے وسیلے سے
سارے ذہنوں پہ تُو خدائی کر

ہیں کٹھن سِلسلے محبّت کے
اے غمِ عشق رہنمائی کر

کجکلاہی کے واسطے آصفؔ
کاسہ بردار بن، گدائی کر



یہ ٹوٹی پھوٹی جو کشتیاں ہیں
گزشتہ طوفان کے نشاں ہیں

پرند برگد میں چھپ رہے ہیں
یہ آندھیاں کیسی آندھیاں ہیں

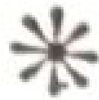
ہوا کے جھونکے یہ پوچھتے ہیں
فلک فلک کیسی بدلیاں ہیں

زمیں کو جھک کر جو چومتی ہیں
شجر کی پھلدار ٹہنیاں ہیں

چھلکتے جذبوں کی صُورتوں میں
سفید باہنوں میں چُوڑیاں ہیں

وفا کی تاریخ لکھ رہا ہُوں
لہُو لہُو میری اُنگلیاں ہیں

یہ شعر گوئی کے رنگ آصفؔ
مری محبّت کے ترجماں ہیں



ترکِ تعلّقات کا امکاں نہیں رہا
وہ مُجھ سے اِس قدر بھی گریزاں نہیں رہا

دِل میں اُتر گیا ہے مِرے نشترِ خزاں
یعنی کوئی بہار کا ساماں نہیں رہا

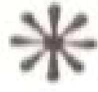
کرتے رہے ہیں اپنے لہُو سے جسے رقم
اُس داستاں کا اَب کوئی عُنواں نہیں رہا

دِل میں نہیں رہی ہے تمنّائے رنگ و بُو
آنکھوں میں جب سے جلوۂ جاناں نہیں رہا

وہ التفاتِ غم کا سزاوار ہی نہیں
جو غم کی آندھیوں سے پریشاں نہیں رہا

ہم کشتیاں جلا کے نکل آئے ہیں شفیق
اَب واپسی کا کوئی بھی اِمکاں نہیں رہا

Scanned with CamScanner



اُس کی آنکھوں کا جو دریا دیکھنا
میری آنکھوں کا بھی صحرا دیکھنا

دیکھنا جب صُبحِ نَو کی تازگی
شامِ غم کا بھی ستارا دیکھنا

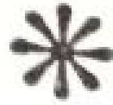
چاند اُبھرا ہے شفق کی جھیل سے
آج تم اپنا سراپا دیکھنا

میری آنکھوں میں کبھی تُم جھانک کر
اپنی صُورت کا اُجالا دیکھنا

وقت نے جو بھی کیا ہے فیصلہ
وقت کے چہرے پہ لکھا دیکھنا

دیکھ لیں ہم نے تُمھاری چاہتیں
اور قسمت میں ہے کیا کیا دیکھنا

سچ بتا آصف تُجھے کیسا لگا
گھر جلا کر خُود تماشا دیکھنا



آنسوؤں کی بارشوں سے جسم جل تھل ہو گیا
رونقوں سے رابطہ اپنا معطّل ہو گیا

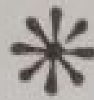
گر رہی ہے برف تیری یاد کی، دہلیز پر
پھر مری سوچوں کا دروازہ مقفّل ہو گیا

عُمر بھر جس کی تمنّا سے گریزاں ہم رہے
جانے کیُوں وہ شخص اپنا آج سانول ہو گیا

جو بتاتا تھا شعورِ زیست کے معنی ہمیں
دیکھتے ہی دیکھتے وہ شخص پاگل ہو گیا

شہرِ جاں میں اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں شفیقؔ
زندگی کا گنگناتا شہر جنگل ہو گیا

خواہشوں کی قید سے نکلیں کسی صورت شفیقؔ
خواہشوں کی یورشوں سے ذہن بوجھل ہو گیا



جو تیری محبت میں گرفتار ہوئے ہیں
وہ لوگ تو رُسوا سرِ بازار ہوئے ہیں

منزل کا تعیّن بھی کیا ہے کبھی ہم نے
کِس کھوج میں یہ قافلے تیّار ہوئے ہیں

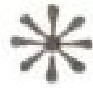
کِس طور شبِ ہجر کٹی اُن کو خبر کیا
جو لوگ ابھی نیند سے بیدار ہوئے ہیں

اِک عمر سے خالی تھے مِری آنکھ کے رَوزن
اِمسال چراغوں سے ضیا بار ہُوئے ہیں

کُچھ شب کی سیاہی میں کمی آنے لگی ہے
کُچھ دن کے اُجالے بھی نمودار ہوتے ہیں

پہلے بھی کبھی درد کا ادراک تھا آصفؔ
یا آج ہی اس کیف سے دوچار ہوئے ہیں

Scanned with CamScanner



اب وہ پہلی سی کہانی بھی نہیں
یاد کی کوئی نشانی بھی نہیں

لکھ رہا ہُوں ایک ساون خواب میں
اور پھر آنکھوں میں پانی بھی نہیں

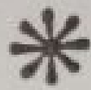
کانپتی ہے کیوں بھلا میری نظر
سامنے اُس کی جوانی بھی نہیں

کیوں ہَوا کے رُخ پہ ہُوں محوِ سفر
میری کشتی بادبانی بھی نہیں

کس لیے پھر دل لگاؤں میں یہاں
زندگی جب غیر فانی بھی نہیں

اب شفق بھی پہلے جیسی ہے کہاں
شام ہے، لیکن سہانی بھی نہیں

کشتیاں بھی بدلی بدلی ہیں شفیقؔ
پانیوں میں وہ روانی بھی نہیں



آرزوئے جاں کے جب سے رابطے کم ہو گئے
ایسے لگتا ہے کہ اپنے حوصلے کم ہو گئے

ہم نے منظر کی کشش کو اپنی آنکھیں سونپ دیں
صُورتوں کی بھیڑ میں جب آئینے کم ہو گئے

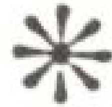
چل رہی ہیں دشتِ جاں میں دُوریوں کی آندھیاں
جانے کیسے چاہتوں کے سِلسلے کم ہو گئے

پھر فصیلِ جاں سے اُبھرا اِک مکمّل آفتاب
روشنی بڑھنے لگی تو حادثے کم ہو گئے

شہر میں بکھری ہوئی تھی بدگمانی کی ہوا
اور چراغِ عزم سے کچھ واہمے کم ہو گئے

اب مُسافر سے سفر آغاز ہوتا کیوں نہیں
اب تو آصفؔ راستوں کے وسوسے کم ہو گئے

Scanned with CamScanner



زندگی کو امتحاں دَر امتحاں رہنے دیا
دوستوں اور دشمنوں کے درمیاں رہنے دیا

ہم کسی سے داستانِ دِل کہیں تو کس طرح
تم نے اِس قابل بھی اے ظالم کہاں رہنے دیا

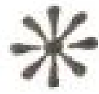
بھُول سکتے تھے کہاں حُسنِ جہاں آرا کو ہم
جس نے آنکھوں میں محبّت کا جہاں رہنے دیا

کیا خبر کب کوئی قیسِ عامری آئے اِدھر
اپنے خوں سے ہم نے نقشِ جاوداں رہنے دیا

کتنے پنچھی تھے کہ جو مجبورِ ہجرت ہو گئے
اور مشیت کے سہارے آشیاں رہنے دیا

کیا ستائے گی کڑکتی دُھوپ آصفؔ روح کو
یاد کے بادل نے سر پہ سائباں رہنے دیا

Scanned with CamScanner



دِل جو صرفِ نظر نہیں ہوتا
آدمی دیدہ ور نہیں ہوتا

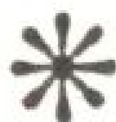
خاک پر کس طرح بکھرتا ہے
پھُول جو شاخ پر نہیں ہوتا

ہم ہیں زندانی ایسے زنداں کے
جس کا کوئی بھی دَر نہیں ہوتا

راستے گنگنانے لگتے ہیں
جب کوئی ہم سفر نہیں ہوتا

مُفلسی جن کے پاس ہوتی ہے
اُن کو لُٹنے کا ڈر نہیں ہوتا

جس کے سینے میں آگ ہو آصفؔ
وہ کبھی بے اثر نہیں ہوتا



درد لمحوں میں بھر گیا کوئی
مجھ کو تنہا سا کر گیا کوئی

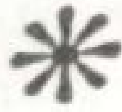
خُون بکھرا ہے ساری پٹڑی پہ
جیسے جاں سے گزُر گیا کوئی

تیرگی کی ردا نہیں باقی
چاند آنگن میں دھر گیا کوئی

ہم کو فرزانگی کا دعویٰ تھا
پل میں دیوانہ کر گیا کوئی

ایک محجوب آرزُو لے کر
غم کی تہہ میں اُتر گیا کوئی

منزلیں یُوں اُداس ہیں آصفؔ
جیسے راہوں میں مَر گیا کوئی



ظُلمت جب تنویر رہے گی
دِل کی کیا توقیر رہے گی

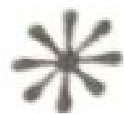
راہِ طلب میں چلنے والو!
پاؤں میں زنجیر رہے گی

جن آنکھوں میں خواب رہیں گے
اُن کے لِئے تعبیر رہے گی

تیرے اندر کی ہر چاہت
چہرے پر تحریر رہے گی

صحرا، صحرا، دریا، دریا
سسّی، سوہنی، ہیر رہے گی

درد کی دولت لے لو آصفؔ
لفظوں میں تاثیر رہے گی



ظلمتوں سے رہائی ہو جائے
روشنی تک رسائی ہو جائے

موسمِ گُل ہے اپنے جوبن پر
زخم کی رُونمائی ہو جائے

لمحہ بھر تجھ کو بھی بھلا بیٹھوں
تُجھ سے کچھ بے وفائی ہو جائے

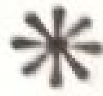
Scanned with CamScanner

کیا خبر تھی کہ یُوں بھی ہونا تھا
بھائی سے دُور بھائی ہو جائے

آپ تھوڑی سی گر توجّہ دیں
میری مُشکل کُشائی ہو جائے

کاش ایسا بھی ہو شفیق آصفؔ
سچ کی ہر سُو خدائی ہو جائے

Scanned with CamScanner



جو دِل کو کسی طور کُشادہ نہیں کرتے
ہم اُن سے مِلیں، ایسا ارادہ نہیں کرتے

اپنوں سے جو لیتے نہیں ہم عارضی خُوشیاں
غیروں سے بھی ہم لوگ اِفادہ نہیں کرتے

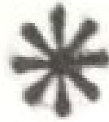
کُچھ ہم نے بھی اوڑھی ہیں تکلّف کی رِدائیں
کچھ وہ بھی روایات کو سادہ نہیں کرتے

وہ چین سے رہنے بھی نہیں دیتے ہیں ہم کو
اور ظلم بھی کچھ حد سے زیادہ نہیں کرتے

جو طائرِ تخئیل کو پرواز نہ بخشیں
ہم ایسے نصابوں کا اعادہ نہیں کرتے

آ جائے جنھیں آنکھوں سے پینے کا سلیقہ
آصف وہ کبھی خواہشِ بادہ نہیں کرتے

Scanned with CamScanner



تیرہ شبی میں اُس سے اُجالا نہ ہو سکا
دِل جل کے روشنی کا حوالہ نہ ہو سکا

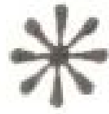
اُڑتا رہا ہوائے زماں کے حصار میں
لیکن وہ شخص پھر بھی ہمالہ نہ ہو سکا

وابستگی رہی ہے مجھے اس سے عُمر بھر
لیکن وہ میرا چاہنے والا نہ ہو سکا

وہ تو تمام عمر رہا قیدِ ذات میں
اُس سے کسی کے غم کا ازالہ نہ ہو سکا

کچھ تیری سرگزشت انوکھی نہیں رہی
کچھ میرا واقعہ بھی نرالا نہ ہو سکا

آصفؔ کے حرف حرف میں حسنِ تمام تھا
پھر بھی وہ میرے چاند کا ہالہ نہ ہو سکا



اُس کا ہے انتظار پھر شاید
دِل ہُوا بے قرار پھر شاید

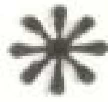
سِسکیاں سُن رہا ہُوں مَیں شب کی
چاند ہے سوگوار پھر شاید

نقشِ پا ڈھونڈتا ہے گلیوں میں
راستے کا غبار پھر شاید

آنسوؤں کی طلب ہے آنکھوں کو
وقت ہے شعلہ بارِ پھر شاید

اپنے خوابوں کے دَر کھُلے رکھنا
آنے والا ہے یارِ پھر شاید

زخم پھر لب کُشا ہوئے آصف
آ رہی ہے بہارِ پھر شاید



رہا ہُوں کرب کی لہروں سے ہمکنار اب تک
ستا رہا ہے مجھے موسمِ بہار اب تک

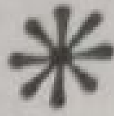
ٹھہر گیا ہے ترا انتظار آنکھوں میں
گیا نہیں مری آنکھوں سے انتظار اب تک

چمن اُجاڑ کے آندھی تو جا چُکی لیکن
پرندے پیڑوں میں بیٹھے ہیں بے قرار اب تک

یہاں شگفتہ ہواؤں کا کون طالب ہے
یہاں تو حبس کا موسم ہے سازگار اب تک

ہے اب بھی وقت اندھیروں کو مات دینے کا
رواں ہے شب کے اسیروں میں یہ پکار، اب تک

وہ شخص لوٹ کے آ بھی چکا مگر آصف
سوار ہے تری سوچوں پہ برف زار اب تک



ذہنوں پہ مسلّط ہے جو ڈر کاش چلا جائے
ایسا نہیں اِمکان تو سر کاش چلا جائے

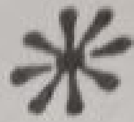
اے کاش کبھی لَوٹ کے آ جائے مِلن رُت
اس موسمِ ہجراں کا اثر کاش چلا جائے

باہر کی فضاؤں میں ہیں آسیب کے پہرے
ہر شخص کی خواہش ہے کہ گھر کاش چلا جائے

رستے میں کسی موڑ پہ آسکتا ہے صحرا
لے ابر سے کچھ زادِ سفر، کاش چلا جائے

ماحول میں پھیلا ہوا نفرت کا اندھیرا
جس سمت سے آیا ہے اُدھر، کاش چلا جائے

راس آیا نہیں عالمِ امکاں ابھی آصفؔ
اس عالمِ امکاں سے بشر کاش چلا جائے



شبنم بدوش شعلہ بیانی کے سلسلے
ہیں ساتھ ساتھ آگ اور پانی کے سلسلے

مثلِ نسیم گزرے ہیں گلزارِ زیست سے
بچپن کے سلسلے کہ جوانی کے سلسلے

لوگوں کو جیسے شہر سے اُلفت نہیں رہی
جاری ہیں اَب تو نقلِ مکانی کے سلسلے

Scanned with CamScanner

کتنے ہیں کربناک مرے دیس میں ابھی
آزادیوں میں ریشہ دوانی کے سلسلے

اپنی جگہ نہ دیر، نہ کعبہ، نہ میکدہ
ملتے ہیں لامکاں سے مکانی کے سلسلے

فرہاد و قیس وامق و رانجھا شفیق سب
میرے فسانے میری کہانی کے سلسلے



آئینے ٹوٹیں گے جب چہرے فنا ہو جائیں گے
ہم حدودِ جاں سے گزرے تو رہا ہو جائیں گے

قربتوں میں آئے گا ایسا مقامِ رنگ و بُو
حرف جتنے ہیں وہ سارے بے صدا ہو جائیں گے

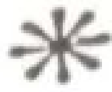
جگنوؤں کا شہر ہو گا جب ترا عکسِ بدن
روشنی کے سارے منظر آئینہ ہو جائیں گے

برگِ گُل سے تیری خوشبو لے کے آئے گی صبا
تتلیوں کے پَر ترا بندِ قبا ہو جائیں گے

رہگزارِ عشق میں ایسا بھی لمحہ آئے گا
جھلملاتے لفظ پلکوں سے ادا ہو جائیں گے

وہ شفیق آصفؔ ، وفا پر جن کی ہم کو ناز تھا
کیا خبر تھی رفتہ رفتہ بے وفا ہو جائیں گے

Scanned with CamScanner



اِک فکرِ درخشاں سے جہاں جاگ رہا ہے
آصفؔ مرا احساسِ جواں جاگ رہا ہے

جو سو گئے وہ سو گئے آغوشِ لحد میں
نازاں ہوں مرا نام و نشاں جاگ رہا ہے

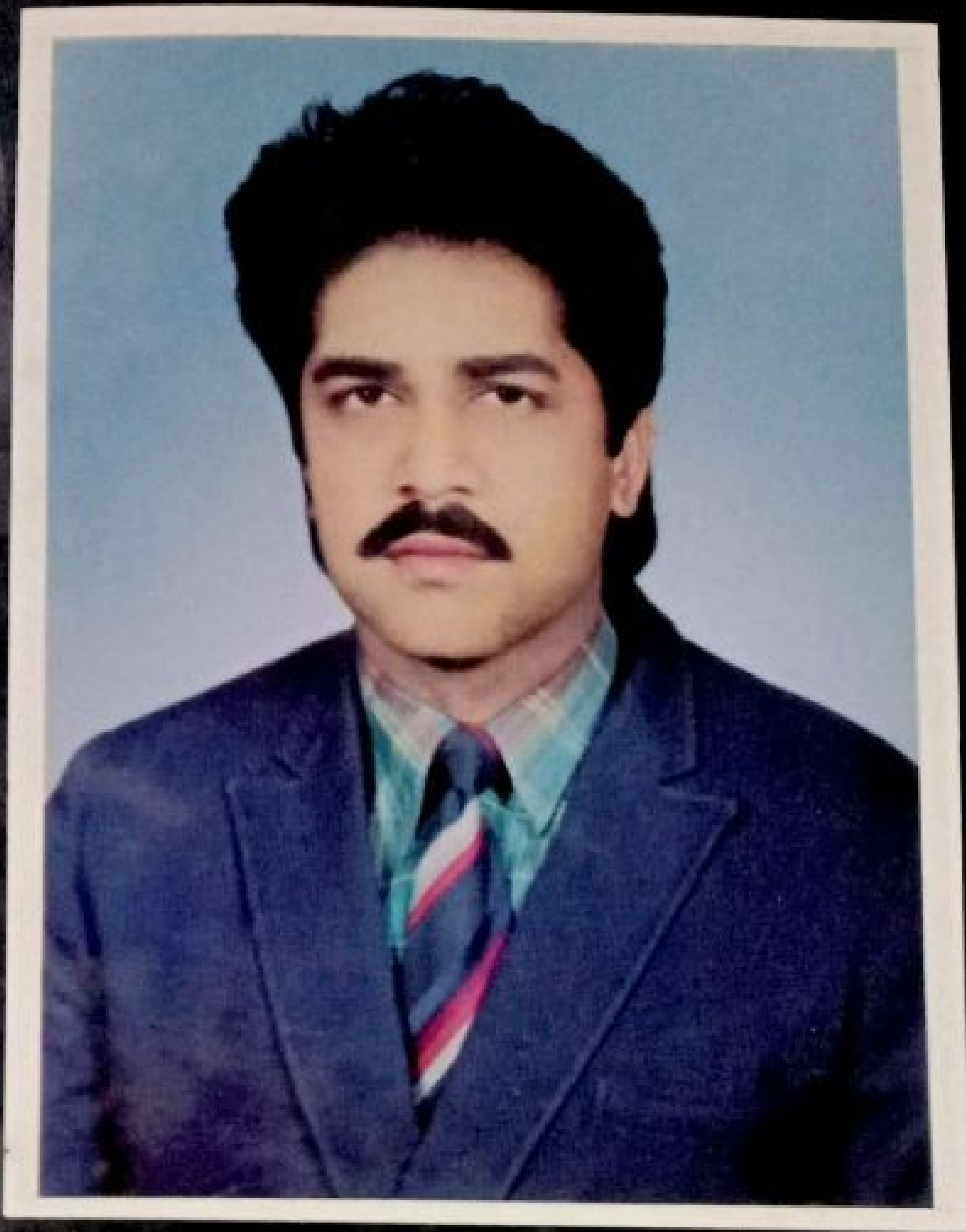
بے چارے غریبوں کی کمائی ہی یہی ہے
جو کچّے گھروندوں میں دھواں جاگ رہا ہے

ہر سُو ہے اندھیروں کا تسلّط سرِ ہستی
اور اس پہ مرا عزمِ جواں جاگ رہا ہے

اس گھور اندھیرے میں ہے کس شخص کی آمد
یہ کس کے لیے شعلۂ جاں جاگ رہا ہے

جذبے ہیں مرے آج بھی اس بات کے شاہد
آنکھوں میں کوئی خوابِ گُماں جاگ رہا ہے

آصفؔ مرے افکار علامت ہیں سحر کی
شعروں میں مرے عصرِ رواں جاگ رہا ہے



ہے میرے دِل کے آئینے میں اِک تصویر مٹّی کی
مِرے مٹّی کے خوابوں کو، مِلی تعبیر مٹّی کی
اُبھرنا اور رنگوں میں اُتر آنا دُھنک بن کر
یہ اندازِ محبّت ہے نئی تفسیر مٹّی کی

شفیق آصف